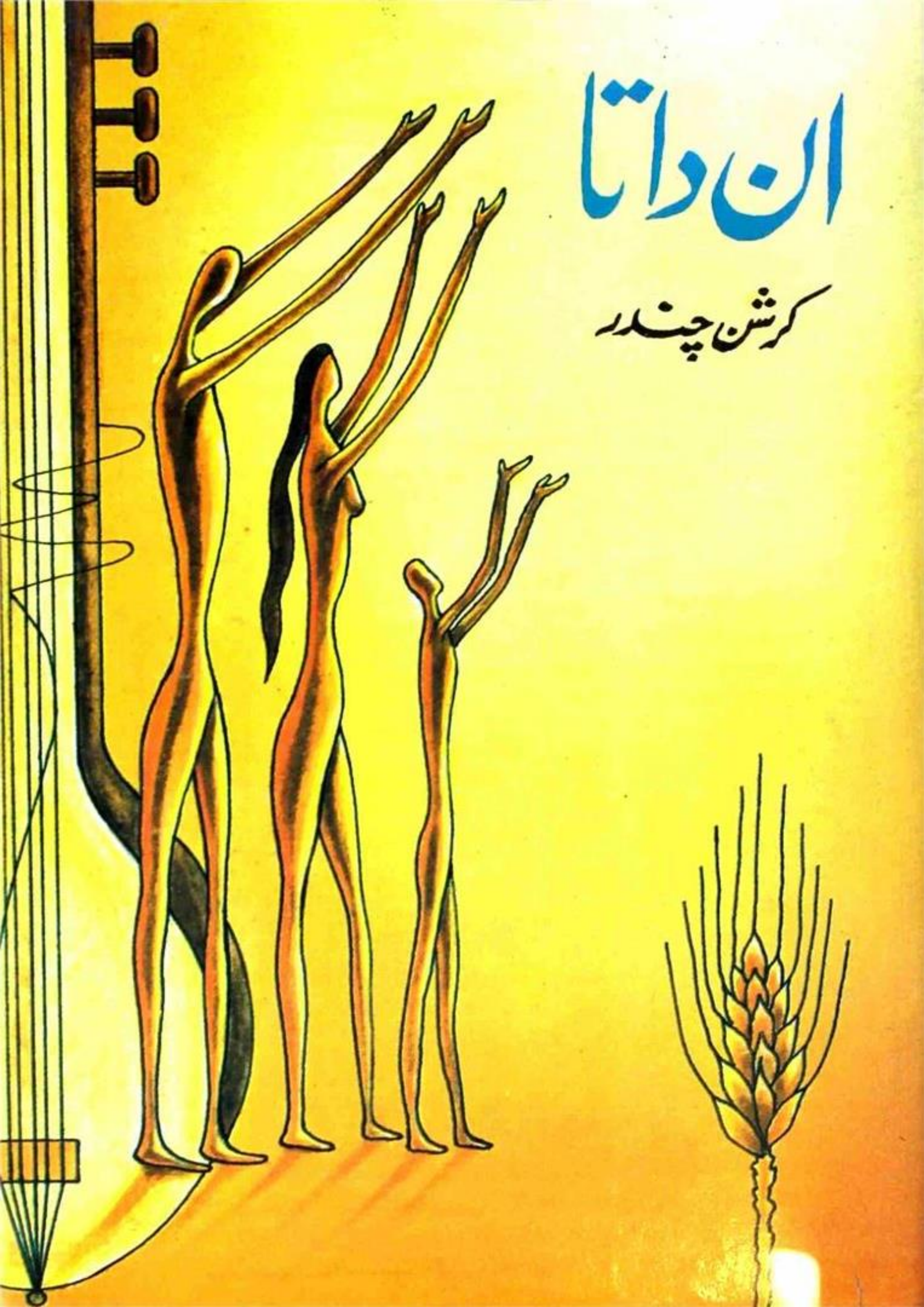


# ان داتا

کرشن چندر





# ان داتا

• کرشن چندر

اولی پبلشر

۴ وجے مارکیٹ رجاپور (نزد بھاگیہ لکشمی اپارٹمنٹ)

سیکٹر ۹ - روہنی - دلی — ۱۱۰۰۸۵



(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

ANNA DAATA  
by  
Krishan Chander

اعجاز نبی  
ایشیا پبلشرز

2004  
Rs. 80

کتابت:

ناشر:

اشاعت:

قیمت:

Distributors:  
STAR PUBLICATIONS,  
Asaf Ali Road,  
NEW DELHI - 110 002.

**ARAVALI PUBLISHERS**  
4, Vijay Market, Rajapur  
(Near Bhagya Laxmi Apartments)  
Sector-9, Rohini-Delhi- 110085



# ان داتا

ترى دنيا ميں محكوم مجبور  
(بال جبريل)



وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے۔  
وہ آدمی جو مرچکا ہے۔  
وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے۔

باب اول  
باب دوم  
باب سوم





## تہذیب

۵	ان داتا	●
۵۷	موبی	●
۹۵	بھگت رام	●
۱۱۵	نشیج کے سامنے	●



# وہ آدمی جس کے ضمیر میں کانٹا ہے



(ایک غیر ملکی قونصل کے مکتوب جو اس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو کلکتہ سے روانہ کئے)  
۸ اگست ۱۹۴۳ء کلایو اسٹریٹ، مون شاہین لا۔

جناب والا۔

کلکتہ، ہندوستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ہوٹہ پل ہندوستان کا سب سے عجیب و غریب پل ہے۔ بنگالی قوم ہندوستان کی سب سے ذہین قوم ہے۔ کلکتہ یونیورسٹی ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔ کلکتہ کا "سونا گاچی" ہندوستان میں طوائفوں کا سب سے بڑا بازار ہے۔ کلکتہ کا سٹندرن جینیو کی سب سے بڑی شکار گاہ ہے۔ کلکتہ جوٹ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ کلکتہ کی سب سے بڑا صبا مسٹھانی کا نام "ریشوگلا" ہے۔ کہتے ہیں ایک طوائف نے ایجا و کیا تھا۔ لیکن شومی قسمت سے وہ اسے پیٹنٹ نہ کرا سکی۔ کیونکہ ان دنوں ہندوستان میں کوئی ایسا قانون موجود نہ تھا۔ اسی لئے وہ طوائف اپنی زندگی کے آخری ایام



میں بھیک مانگتے مری۔ ایک الگ پارسل میں حضور پر نور کی ضیافتِ طبع کے لئے دو سو "رشو گٹلے" بھیج رہا ہوں۔ اگر انہیں قیچے کے ساتھ کھایا جائے تو میتِ مراد دیتے ہیں۔ میں نے خود تجربہ کیا ہے۔

میں ہوں جناب کا ادنیٰ ترین خادم  
ایف۔ بی۔ پٹاخا  
تو نصل مملکتِ ساندوگھاس برائے کلکتہ

## ۹ اگست کلاپو اسٹریٹ

جناب والا۔

حضور پر نور کی منجھلی بیٹی نے مجھ سے سپرے کی بین کی فرمائش کی تھی۔ آج شام بازار میں مجھے ایک سپر امل گیا۔ پچیس ڈالر دیکر میں نے ایک خوبصورت بین خرید لی ہے۔ یہ بین اسفنج کی طرح ہلکی اور سبک اندام ہے۔ یہ ایک ہندوستانی پھل سے جسے "لوکی" کہتے ہیں۔ نیار کی جاتی ہے۔ یہ بین بالکل ہاتھ کی نبی ہوئی ہے۔ اور اسے نیار کرتے وقت کسی مشین سے کام نہیں لیا گیا۔ میں نے اس بین پر پالش کرایا ہے اور اسے ساگوان کے ایک خوشنما بکس میں بند کر کے حضور پر نور کی منجھلی بیٹی ایدتھ کے لئے بطور تحفہ ارسال کر رہا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم  
ایف۔ بی۔ پٹاخا



## ۱۰ اگست

کلکتہ میں ہمارے ملک کی طرح راشٹنگ نہیں ہے۔ غذا کے معاملہ میں ہر شخص کو مکمل شخصی آزادی ہے۔ وہ ہزاروں سے جتنا اناج چاہے خریدے کل مملکت ٹلی کے قوانین نے مجھے کھانے پر مدعو کیا چھبیس قسم کے گوشت کے سالن تھے سبز لیں اور میٹھی چیزوں کے دو درجن کورس تیار کئے گئے تھے۔ (نہایت عمدہ شراب تھی) ہمارے ہاں جیسا کہ حضور اچھی طرح جانتے ہیں پیاز تک کی راشٹنگ ہے اس لحاظ سے کلکتہ کے باشندے بڑے خوش قسمت ہیں۔ کھانے پر ایک ہندوستانی انجنیر بھی مدعو تھے۔ یہ انجنیر ہمارے ملک کا تعلیم یافتہ ہے۔ بالوں باتوں میں اس نے ذکر کیا کہ کلکتہ میں قحط پڑا ہوا ہے۔ اس پر ٹلی کا قانونصل قہقہہ مار کر سننے لگا۔ اور مجھے بھی اس سنسنی میں شریک ہونا پڑا۔ دراصل یہ بڑھے لکھے۔ ہندوستانی بھی بڑے جاہل ہوتے ہیں۔ کتابی علم سے قطع نظر انہیں اپنے ملک کی صحیح حالت کا کوئی انداز نہیں۔ ہندوستان کی دو تہائی آبادی دن رات غلہ اور بچے پیدا کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اس لئے یہاں پر غلے اور بچوں کی کمی کبھی نہیں ہونے پاتی، بلکہ جنگ سے پیشتر تو بہت سا غلہ دساور کو جاتا تھا۔ اور بچے قلی بنا کر جنوبی افریقہ بھیج دیے جاتے تھے۔ اب ایک عرصے سے قلیوں کا باہر بھیجنا بند کر دیا گیا ہے۔ اور ہندوستانی صوبوں کو "ہوم رول" دیدیا گیا ہے۔ مجھے یہ ہندوستانی انجنیر تو کوئی ایچی ٹیر قسم کا خطرناک آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں نے موسیو تراں تراں تربی ٹلی کے قوانین سے اس کا تذکرہ چھپرا تو موسیو تراں تراں تربی ٹلی نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ رائے دی کہ ہندوستانی اپنے ملک پر حکومت کی قطعاً



اہلیت نہیں رکھتا۔ چونکہ موسیو ڈاں ڈاں تربیپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس لئے میں ان کی رائے و فیہ سمجھتا ہوں۔

میں ہوں جناب کا خادم

ایف۔ بی۔ پی

## ۱۱ اگست

آج صبح بولپور سے واپس آیا ہوں۔ وہاں ڈاکٹر ٹیگر کا "شانتی نکیتاں" دیکھا۔ کہنے کو تو یہ ایک یونیورسٹی ہے لیکن پڑھائی کا یہ عالم ہے کہ طالب علموں کے سمجھنے کے لئے ایک پنج بھی نہیں۔ استاد اور طالب علم سب ہی درختوں کے نیچے آلتی پالتی مارے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور خدا جانے کچھ پڑھتے بھی ہیں یا یوں ہی اونگھتے ہیں۔ میں وہاں سے بہت جلد آیا۔ کیونکہ دھوپ بہت تیز تھی اور اوپر درختوں کی شاخوں پر چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔

ف۔ ب۔ پ

## ۱۲ اگست

آج چینی قونصل کے ہاں پنچ پر پھر کسی نے کہا کہ کلکتہ میں سخت فحش پراہوا ہے۔ لیکن وثوق سے کچھ نہ کہہ سکا کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ ہم سب لوگ حکومت بنگال کے اعلان کا انتظار کر رہے ہیں۔ اعلان کے جاری ہوتے ہی حضور



کو مزید حالات سے مطلع کر دینگا۔ بیگ میں حضور پر نور کی منجھلی بیٹی ایدہ سندھ کے لئے ایک جوتی بھی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ جوتی سبز رنگ کے سانپ کی جلد سے بنائی گئی ہے۔ سبز رنگ کے سانپ برما میں بہت ہوتے ہیں، امید ہے کہ جب برما دوبارہ حکومت انگلشیہ کی عملداری میں آجائے گا تو ان جوتیوں کی تجارت کو بہت فروغ حاصل ہو سکے گا۔

میں ہوں جناب کا وغیرہ وغیرہ

ایف۔ بی۔ پی

## ۱۳ اگست

آج ہمارے سفارت خانے کے باہر دو عورتوں کی لاشیں پائی گئی ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ معلوم ہوتی تھیں۔ شاید "سکھیا" کی بیماری میں مبتلا تھیں ادھر بنگال میں اور غالباً سارے ہندوستان میں "سکھیا" کی بیماری پھیلی ہوئی ہے۔ اس عارضے میں انسان گھلتا جاتا ہے۔ اور آخر میں سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مر جاتا ہے۔ یہ بڑی خوفناک بیماری ہے۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی علاج دریافت نہیں ہوا۔ کونین کثرت سے مفت تقسیم کی جا رہی ہے۔ لیکن کونین میگنیشیا یا کسی اور مغربی دوا سے اس عارضے کی شدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دراصل ایشیائی بیماریوں کو نوعیت مغربی امراض سے مختلف ہے۔ بہت مختلف ہے۔ یہ اختلاف اس مفروضے کا بدیہی ثبوت ہے کہ ایشیائی اور مغربی دو مختلف انسان ہیں۔



حضور پر نور کی رفیقہ حیات کے ہاتھوں میں جنم دن کی خوشی میں بدھ  
 کا ایک مہر کا ثبت ارسال کر رہا ہوں۔ اسے میں نے پانسو ڈالر میں خریدا ہے۔ یہ  
 مہاراجہ بندھو سار کے زمانے کا ہے۔ اور مقدس راہب خانے کی زینت تھا۔  
 حضور پر نور کی رفیقہ حیات کے ملاقاتیوں کے کمرے میں خوب سجے گا۔  
 مکرر عرض ہے کہ سفارت خانے کے باہر ٹپھی ہوئی لاشوں میں ایک بچہ  
 بھی تھا جو اپنی مردہ ماں سے دودھ چوسنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میں نے  
 اسے ہسپتال بھجوا دیا ہے۔

حضور پر نور کا غلام

ایف۔ بی۔ پی

## ۱۴ اگست

ڈاکٹر نے بچے کو ہسپتال میں داخل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بچہ ابھی  
 سفارت خانہ میں ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ حضور پر نور کی ہدایت کا انتظار  
 ہے۔ مٹی کے قونصل نے مشورہ دیا ہے کہ اس بچے کو جہاں سے پایا سے پاس تھا۔ وہیں  
 چھوڑ دوں۔ لیکن میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ اپنے حکومت کے صدر سے مشورہ  
 کئے بغیر کوئی ایسا اقدام کروں۔ جس کے سیاسی نتائج بھی نہ جانے کتنے مہلک  
 ثابت ہوں۔

ایف۔ بی۔ پی



## ۱۶ اگست

آج سفارت خانے کے باہر پسر لاشیں پائی گئیں۔ یہ سب لوگ بھی اسی بیماری کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ جس کا میں اپنے گزشتہ مکتوبات میں ذکر کر چکا ہوں۔ میں نے بچے کو انہی لاشوں میں چپکے سے رکھ دیا ہے۔ اور پولیس کو ٹیلی فون کر دیا ہے کہ وہ انہیں سفارت خانے کی سڑکیوں سے اٹھانے کا بندوبست کرے۔ امید ہے آج شام تک سب لاشیں اٹھ جائیں گی۔

ایف۔ بی۔ پی

## ۱۷ اگست

کلکتہ کے انگریزی اخبار "سیٹیمین" نے اپنے افتتاحیہ میں آج اس امر کا اعلان کیا ہے کہ کلکتہ میں سخت قحط پھیلا ہوا ہے۔ یہ اخبار چند روز سے قحط زدگان کی تصاویر بھی شائع کر رہا ہے۔ ابھی تک وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نوٹواصلی ہیں یا نقلی۔ بظاہر تو یہ نوٹو سوکھیا کی بیماری کے پرانیوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تمام غیر ملکی تو فیصل اپنی رائے "محفوظ" رکھ رہے ہیں۔

ایف۔ بی۔ پی

## ۲۰ اگست

سوکھیا کی بیماری کے مریضوں کو اب ہسپتال میں داخل کرنیکی اجازت مل گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صرف کلکتہ میں روز دو ڈھائی سو آدمی اس بیماری کا شکار



ہو جاتے ہیں۔ اور اب یہ بیماری ایک وبائی صورت اختیار کر گئی ہے۔ ڈاکٹر لوگ بہت پریشان ہیں کیونکہ کونین کھلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مرض میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوتی۔ ہاضمے کا مسکھر میگنیشیا مکسچر اور شکیر آیوڈین پورا برٹش فایما کو پیلا بیکار ہے۔ چند مریضوں کا خون لے کر مغربی سائنسدانوں کے پاس بغرض تحقیق بھیجا جا رہا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ کسی غیر معمولی مغربی ایکسپیرٹ کی خدمت بھی حاصل کی جائیں یا ایک رائل کمیشن بٹھا دیا جائے جو چار پانچ سال میں اچھی طرح چھان بین کر کے اس امر کے متعلق اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے۔ الغرض ان غریب مریضوں کو بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ شد و مد کے ساتھ اعلان کیا گیا ہے کہ سارے بنگال میں قحط کا دور دورہ ہے اور ہزاروں آدمی ہر سہفتے غذا کی کمی کی وجہ سے مر جاتے ہیں لیکن ہماری نوکرائی (جو خود بنگال میں ہے) کا خیال ہے کہ یہ اخبار چچی جھوٹ بولتے ہیں۔ جب وہ بازار میں چیزیں خریدنے جاتی ہے تو اسے ہر چیز مل جاتی ہے۔ دام بے شک بڑھ گئے ہیں۔ لیکن یہ مہنگائی تو جنگ کی وجہ سے ناگزیر ہے۔

ایف۔ بی۔ پی

## ۲۵ اگست

آج سیاسی حلقوں نے قحط کی تردید کر دی ہے۔ بنگال اسمبلی نے جس میں ہندوستانی ممبروں اور وزراء کی کثرت ہے۔ آج اعلان کر دیا ہے کہ کلکتہ اور بنگال کا علاقہ "قحط زدہ علاقہ" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس کا یہ



مطلب بھی ہے کہ بنگال میں فی الحال راشننگ نہ ہوگا۔ یہ خبر سنکر غیر ملکی  
 قونصلوں کے دل میں اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اگر بنگال قحط زدہ  
 علاقہ قرار دیدیا جاتا تو ضرور راشننگ کا فی الفور نفاذ ہوتا اور —  
 میرا مطلب ہے کہ اگر راشننگ کا نفاذ ہوتا تو اس کا اثر ہم لوگوں پر بھی  
 پڑتا۔ موسیوسنگل جو فریج قونصل میں کل ہی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ عین  
 ممکن ہے کہ راشننگ ہو جائے۔ اس لئے تم ابھی سے شراب کا بندوبست  
 کر لو۔ میں چند رنگر سے فرانسیسی شراب منگوانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ سنا  
 ہے کہ چند رنگر میں کسی موسال پرانی شراب بھی دستیاب ہوتی ہے۔ بلکہ اکثر  
 شرابیں تو انقلاب فرانسیس سے بھی پہلے کی ہیں۔ اگر حضور پر نور مطلع فرمائیں  
 تو چند بوتلیں چکھنے کے لئے بھیج دوں۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲۸ اگست

کل ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں نے نیو مارکیٹ سے اپنی سب  
 سے چھوٹی مہن کے لئے چند کھلونے خریدے۔ ان میں ایک چینی کی گڑیا بہت  
 ہی حسین تھی۔ اور ماریا کو بہت پسند تھی۔ میں نے ڈیڑھ ڈالر دیکر وہ گڑیا  
 بھی خرید لی اور ماریا کو انگلی سے لگائے باہر آگیا۔ کار میں بیٹھنے کو تھا کہ ایک  
 ادھیر عمر کی بنگالی عورت نے میرا کوٹ پکڑ کر مجھے بنگالی زبان میں کچھ کہا۔  
 میں نے اس سے اپنا دامن چھڑا لیا۔ اور کار میں بیٹھ کر اپنے بنگالی



شو فر سے پوچھا۔

"یہ کیا چاہتی ہے؟"

ڈرائیور بنگالی عورت سے بات کرنے لگا۔ اس عورت نے جواب دیتے ہوئے اپنی لڑکی کی طرف اشارہ کیا جسے وہ اپنے شانے سے لگائے کھڑی تھی۔ بڑی بڑی موٹی آنکھوں والی زرد زرد بچی بالکل چینی کی گڑ یا معلوم ہوتی تھی۔ اور ماریا کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔

پھر بنگالی عورت نے تیزی سے کچھ کہا، بنگالی ڈرائیور نے اسی سرعت سے جواب دیا۔

"کیا کہتی ہے یہ؟" میں نے پوچھا۔

ڈرائیور نے اس عورت کی تفصیلی پر چند سکے رکھے اور کار آگے بڑھائی۔ کار چلاتے چلاتے بولا۔

"حضور یہ اپنی بچی کو بیچنا چاہتی تھی۔ ڈیڑھ روپے میں۔"  
 "ڈیڑھ روپے میں، یعنی نصف ڈالر میں۔؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ارے نصف ڈالر میں تو چینی کی گڑ یا بھی نہیں آتی۔؟"  
 "آج کل نصف ڈالر میں بلکہ اس سے بھی کم قیمت پر ایک بنگالی بچی مل سکتی ہے۔۔۔۔۔!"

میں حیرت سے اپنے ڈرائیور کو نکتا رہ گیا۔

اس وقت مجھے اپنے وطن کی تاریخ کا وہ باب یاد آیا جب ہمارے



آباد و اجداد افریقہ سے حبشیوں کو زبردستی جہاز میں لا کر اپنے ملک میں لے آئے تھے۔ اور منڈیوں میں غلاموں کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ ان دنوں ایک معمولی سے معمولی حبشی بھی پچیس تیس ڈالر سے کم میں نہ بکتا تھا۔ افوہ، کس قدر غلطی ہوئی۔ ہمارے بزرگ اگر افریقہ کے بجائے ہندوستان رخ کرتے تو بہت سستے داموں غلام حاصل کر سکتے تھے حبشیوں کے بجائے اگر وہ ہندوستانیوں کی تجارت کرتے تو لاکھوں ڈالر کی بچت ہو جاتی۔ ایک ہندوستانی لڑکے کی صرف نصف ڈالر میں۔! اور ہندوستان کی بھی آبادی چالیس کروڑ ہے۔ گویا بیس کروڑ ڈالر میں ہم پورے ہندوستان کی آبادی کو خرید سکتے تھے۔ ذرا خیال تو فرمائیے کہ بیس کروڑ ڈالر ہوتے ہی کتنے ہیں۔ اس سے زیادہ رقم تو ہمارے وطن میں ایک یونیورسٹی قائم کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

اگر حضور پر نور کی منجھلی بیٹی کو یہ پسند ہو تو میں ایک درجن بنگالی لڑکیاں خرید کر بندریہ ہوائی جہاز پارسل کروں۔! تب شو فرنے بتایا کہ آجکل "سونا کاچی" جہاں کلکتہ کی طوائفیں رہتی ہیں۔ اس قسم کی بردہ فروشی کا اڈہ ہے۔ سیکڑوں کی تعداد میں لڑکیاں شب و روز فروخت کی جا رہی ہیں۔

لڑکیوں کے والدین فروخت کرتے ہیں۔ اور رندیاں خریدتی ہیں۔ عام نرخ سواروپہ ہے۔ لیکن اگر بچی قبول صورت ہو تو چار پانچ بلکہ دس روپے بھی مل جاتے ہیں۔ چاول آجکل بازار میں ساٹھ ستر روپے فی من ملتا ہے۔ اس حساب سے اگر ایک کنبہ اپنی دو بچیاں بھی فروخت کرے



تو کم از کم آٹھ دس دن اور زندگی نکادھنڈا کیا جاسکتا ہے۔ اور اوسطاً  
 بنگالی کہتے ہیں ٹرکیوں تعداد دو سے زیادہ ہوتی ہے۔  
 کل میئر آف کلکتہ نے شام کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ وہاں یقیناً  
 بہت سی دلچسپ باتیں سننے میں آئیں گی۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲۹ اگست

میئر آف کلکتہ کا خیال ہے کہ بنگال میں شدید قحط ہے۔ اور حالت  
 بیکار خطرناک ہے۔ اس نے مجھ سے اپیل کی کہ میں اپنی حکومت کو بنگال کی مدد  
 کے لئے آمادہ کروں۔ میں نے اسے اپنی حکومت کی ہمدردی کا یقین دلایا لیکن  
 یہ امر بھی اس پر واضح کر دیا کہ یہ قحط ہندوستان کا اندرونی مسئلہ ہے اور  
 ہماری حکومت کسی دوسری قوم کے معاملات دخل دینا نہیں چاہتی۔ ہم سچے  
 جمہوریت پسند ہیں۔ اور کوئی سچا جمہور یہ آپ کی آزادی کو سلب کرنا نہیں  
 چاہتا۔ ہر ہندوستانی کو جینے یا مرنے کا اختیار ہے۔ یہ ایک شخصی یا زیادہ  
 سے زیادہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ اور اس کی نوعیت بین الاقوامی نہیں۔ اس موقع  
 پر میونسپل کونسل میں بھی بحث میں شامل ہو گئے اور کہنے لگے۔

جب آپ کی اسمبلی نے بنگالی کو قحط زدہ علاقہ Famine Area  
 ہی نہیں قرار دیا تو اس صورت میں آپ دوسری حکومتوں سے مدد کیونکر طلب کر سکتے  
 ہیں۔ اس پر میئر آف کلکتہ خاموش ہو گئے اور دس گھنٹے کھانے لگے۔

ف۔ ب۔ پ



## ۳۔ اگست

مسٹر ایمری نے جو برطانوی وزیر ہند ہیں۔ ہاؤس آف کامنز میں ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا کہ ہندوستان میں آبادی کا تناسب غذائی اعتبار سے حوصلہ شکن ہے۔ ہندوستان کی آبادی میں ڈیڑھ سو گنا اضافہ ہوا ہے۔ در حالیکہ زمینی پیداوار بہت کم بڑھی ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہندوستانی بہت کھاتے ہیں۔

یہ تو حضور میں نے بھی آزمایا ہے۔ کہ ہندوستانی لوگ دن میں دو بار بلکہ اکثر حالتوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔ لیکن اس قدر کھاتے ہیں کہ ہم مغربی لوگ دن میں پانچ بار بھی اس قدر نہیں کھا سکتے۔ موسیو ٹراں ٹراں تریپ کا خیال ہے کہ بنگال میں شرح اموات کے بڑھنے کی سب سے بڑی وجہ یہاں کے لوگوں کا پیٹو پن ہے۔ یہ لوگ اتنا کھاتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں تو پیٹ پھٹ جاتا ہے۔ اور وہ جہنم واصل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مثل مشہور ہے کہ ہندوستانی کبھی منہ پھٹ نہیں ہوتا۔ لیکن پیٹ پھٹ ضرور ہوتا ہے بلکہ اکثر حالتوں میں تلی پھٹ بھی پایا۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ ہندوستانیوں اور چوہوں کی شرح پیدائش دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ اور اکثر حالتوں میں ان دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ جتنی جلدی پیدا ہوتے ہیں اتنی جلدی مر جاتے ہیں۔ اگرچہ ہوں کو پلنگ ہوتی ہے تو ہندوستانیوں کو "سوکھیا" بلکہ عموماً پلنگ اور سوکھیا دونوں لاحق ہو جاتی ہیں۔ میر حال جب تک چوہے اپنے بل میں رہیں اور دنیا کو پریشان



نہ کریں۔ ہمیں ان کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔  
 غذائی محکمے کے ممبر حالات کی جانچ پڑتال کے لئے تشریف لائے ہیں۔  
 بنگالی حلقوں میں یہ امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ آنریبل ممبر پر اب یہ واضح ہو  
 جائے گا کہ بنگال میں واقعی فحط ہے۔ اور شرح اموات کے بڑھنے کا سبب  
 بنگالیوں کی انارکٹا نہ حرکات نہیں بلکہ غذائی بحران ہے۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲۰ ستمبر

آنریبل ممبر تحقیقات کے بعد واپس چلے گئے ہیں۔ سنا ہے۔ وہاں  
 حضور وائیس رائے بہادر سے ملاقات کر نیگے اور اپنی تنجا ویزاں کے سامنے  
 رکھیں گے۔

## ۲۵ ستمبر

لندن کے انگریزی اخباروں کی اطلاع کے مطابق ہر روز کلکتہ  
 کی گلیوں اور سڑکوں، فٹ پاتھوں پر لوگ مرجاتے ہیں۔ بہر حال یہ سب  
 اخباری اطلاعات ہیں۔ سرکاری طور پر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ بنگال میں  
 فحط ہے۔ سب پریشان ہیں۔ چینی تو فصل کل مجھ سے کہہ رہا تھا کہ وہ بنگال  
 کے فاقہ کشوں کے لئے ایک امدادی فنڈ کھولنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں  
 نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کوئی کہتا ہے کہ فحط ہے کوئی کہتا ہے فحط



منہیں ہے۔ میں نے اسے سمجھایا۔ بیوقوف نہ ہو۔ اس وقت تک ہمارے پاس  
مصدقہ اطلاق یہی ہے کہ غذائی بحران اس لئے ہے کہ ہندوستانی بہت زیادہ  
کھاتے ہیں۔ اب ہم ان لوگوں کے لئے ایک امدادی فنڈ کھول کر گویا ان کے  
پیٹوں کو اور شہہ دو گئے۔ یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن چینی قونصل  
میری تشریحات سے غیر مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲۸ ستمبر

دلی میں غذائی مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک کانفرنس بلائی جا رہی  
ہے۔ آج پھر یہاں کئی سو لوگ "سو کھیا" سے مر گئے۔ یہ بھی خبر آئی ہے کہ مختلف  
صوبائی حکومتوں نے رعایا میں اتاج تقسیم کرنے کی جو سکیم بنائی ہے۔ اس  
سے آہنیوں نے کئی لاکھ روپے کا منافع حاصل کیا ہے۔ اس میں بنگال کی  
حکومت بھی شامل ہے۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲ اکتوبر

کل گراند ہوٹل میں "یوم بنگال" منایا گیا۔ کلکتہ کے یورپین امراء  
و مشرفاء کے علاوہ حکام اعلیٰ، شہر کے بڑے سیٹھ اور مہاراجے بھی اس  
دلیپ تفریح میں شریک تھے۔ ڈانس کا انتظام خاص طور پر اچھا تھا۔  
میں نے مسز جیولٹ تریپ کے ساتھ دو مرتبہ ڈالٹی کیا (مسز تریپ کے منہ



نئے لہسن کی بو آتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ " مسز تریپ سے یہ معلوم ہوا کہ اس سہین ماہستانی کے موقعہ پر یوم ننگال کے سلسلہ میں نو لاکھ روپیہ اکٹھا ہوا ہے۔ مسز تریپ بار بار چاند کی خوب صورتی اور رات کی سیاہ ملامت کا ذکر کر رہی تھیں۔ اور ان کے منہ سے لہسن کے بھپارے اٹھ رہے تھے۔ جب مجھے ان کے ساتھ دوبارہ ڈانس کرنا پڑا تو میرا جی چاہتا تھا کہ ان کے منہ پر لالی سول یا فینائل چھڑک کر ڈانس کروں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مسز جیولٹ تریپ موسیو ڈال ڈال تریپ کی باوقار بیوی ہیں۔ اور موسیو ڈال ڈال تریپ کی حکومت کو بین الاقوامی معاملات میں ایک قابل رشک مرتبہ حاصل ہے۔

ہندوستانی خواتین میں مس سینہ سے تعارف ہوا۔ بری قبول صورت ہے۔ اور بے حد اچھا ناچتی ہے۔  
ف۔ ب۔ پ

## ۲۶ اکتوبر

مسٹر منشی حکومت ممبئی کے ایک سابق وزیر کا اندازہ ہے کہ ننگال میں ہر ہفتے قریباً ایک لاکھ افراد قحط کا شکار ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ سرکاری اطلاع نہیں ہے۔ تو فصل خانے کے باہر آج پھر حید لاشیں پائی گئیں۔ شو فرنے بتایا کہ یہ ایک پورا خاندان تھا جو دیہات سے روٹی کی تلاش میں کلکتہ آیا تھا۔ پرسوں بھی اسی طرح میں نے ایک مغنی کی لاش دیکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ اپنی ستار پکڑے ہوئے تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں لکڑی کا ایک جھنجھنا۔ سمجھ نہیں آیا۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ بیچارے چوہے کس طرح چپ چاپ مرجاتے ہیں اور زبان



سے آف تک بھی نہیں کرتے۔ میں نے ہندوستانیوں سے زیادہ شریفی چو ہے  
 دنیا میں اور کہیں نہیں دیکھے۔ اگر امن پسندی کے لئے نوبل پرائز کسی قوم کو مل سکتا  
 ہے۔ تو وہ ہندوستانی ہیں۔ یعنی لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مرجاتے ہیں۔ لیکن  
 زبان پر ایک کلمہ شکایت نہیں لائیں گے۔ صرف بے روح، بے نور آنکھوں سے  
 آسمان کی طرف تکتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ اُن داتا۔ اُن داتا۔ اکل رات پھر  
 مجھے اس معنی کی خاموش شکایت سے معمور، جامد و ساکت تنہا بے نور سی  
 نگاہیں پریشان کرتی رہیں۔  
 ف - ب - پ

## ۵۔ نوبل

نئے حضور و السرائے بہادر شریف لائے ہیں۔ سنا ہے کہ انہوں نے  
 فوج کو قحط زدہ لوگوں کی امداد پر مامور کیا ہے۔ اور جو لوگ کلکتہ کے گلی کوچوں  
 میں مرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے لئے ہاہر مضافات میں مرکز کھول دیئے  
 گئے ہیں۔ جہاں ان کی آسائش کے لئے سب سامان بہم پہنچایا جائے گا۔

ف - ب - پ

## ۱۰۔ نوبل

موسیو ٹران ٹران نریپ کا خیال ہے کہ یہ عین ممکن ہے کہ بنگال میں  
 واقعی قحط ہو اور سوکھیا کی بیماری کی اطلاعیں غلط ہوں۔ غیر ملکی تو نصل خانوں  
 میں اس بیمارک سے ہل چل مچ گئی ہے۔ مملکت گوبیا، لوبیا اور مٹر سلو دیا



کے قونصلوں کا خیال ہے کہ موسیو ٹراں ٹراں تریپ کا یہ جملہ کسی آنے والی خوفناک جنگ کا پیش خیمہ ہے۔ یورپی اور ایشیائی ملکوں سے بھاگے ہوئے لوگوں میں آج کل ہندوستان میں مقیم ہیں وائسرائے کی اسکیم کے متعلق مختلف شبہات پیدا ہوئے ہیں۔ وہ لوگ سوچ رہے ہیں۔ اگر بنگال واقعی قحط زدہ علاقہ قرار دیا گیا تو ان کے الاؤنس کا کیا بنے گا۔ وہ لوگ کہاں جائیں گے۔ یہیں حضور پر نور کی توجہ اس سیاسی الجھن کی طرف دلانا چاہتا ہوں، وائسرائے بہادر کے اعلان سے پیدا ہو گئی ہے۔ مغرب کے ملکوں کے رفیو جیوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے کیا ہمیں سینہ سپر ہو کر نہ لڑنا چاہیے۔ مغربی تہذیب کلچر اور تمدن کے کیا تقاضے ہیں۔ آزاد کا اور جمہوریت کو برقرار رکھنے کے لئے ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ میں اس سلسلہ میں حضور پر نور کے احکام کا منتظر ہوں۔

ف۔ ب۔ پ

## ۲۵ نومبر

موسیو ٹراں ٹراں تریپ کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط نہیں ہے۔ موسیو فاں فاں فنگ چینی قونصل کا خیال ہے کہ بنگال میں قحط ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ حضور نے مجھے جس کام کے لئے کلکتہ کے قونصل خانے میں تعینات کیا تھا۔ وہ کام میں گزشتہ تین ماہ میں بھی پورا نہ کر سکا۔ میرے پاس اس امر کی ایک بھی مصدقہ اطلاع نہیں ہے کہ بنگال میں قحط ہے یا نہیں ہے۔ تین ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد بھی مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ صبح ٹوپو میٹیاک پوزیشن کیا ہے۔ میں اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہوں، شرمندہ ہوں۔ معافی چاہتا ہوں۔



نیز عرض ہے کہ حضور پر نور کی منجھلی بیٹی کو مجھ سے اور مجھے حضور پر نور  
کی منجھلی بیٹی سے عشق ہے۔ اس لئے کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ حضور پر نور مجھے کلکتہ کے  
سفارت خانے سے واپس بلا لیں اور میری شادی اپنی بیٹی ————— میرا  
مطلب ہے حضور پر نور کی منجھلی بیٹی سے کر دیں۔ اور حضور پر نور مجھے کسی ممتاز  
سفارت خانے میں سفیر اعلیٰ کا مرتبہ بخش دیں۔ اس نوازش کے لئے میں حضور  
پر نور کا ناقیامت شکر گزار ہوں گا۔

ایڈتھ کے لئے ایک نسیم کی انگوٹھی ارسال کر رہا ہوں۔ اسے مہاراجہ  
اشوک کی بیٹی پہنا کر فی سہتی۔

میں ہوں جناب کا حقیر ترین خادم

ایف . بی . پٹاخہ

قونصل مملکت سائڈوگھاس برائے کلکتہ





# وہ آدمی جو مر چکا ہے



صبح ناشتہ پر جب اس نے اخبار کھولا تو اس نے بنگال کے قاقہ کشوں کی تصاویر دیکھیں جو سڑکوں پر، درختوں کے نیچے، گلیوں میں، کھیتوں میں بازاروں میں، گھروں میں ہزاروں کی تعداد میں مر رہے تھے آبلٹ کھاتے کھاتے اس نے سوچا کہ ان غریبوں کی امداد کس طرح ممکن ہے۔ یہ غریب جو ناامید کی منزل سے آگے جا چکے ہیں۔ اور موت کی بحرانی کیفیت سے ہمکنار ہیں۔ انہیں زندگی کی طرف واپس لانا۔ زندگی کی صعوبتوں سے دوبارہ آشنا کرنا، ان سے ہمدردی نہیں دشمنی ہوگی۔

اس نے جلدی میں اخبار کا ورق الٹا اور توس پر مربہ لگا کر کھانے لگا۔ توس نرم گرم اور کرکڑا تھا۔ اور مربے کی مٹھاس اور اس کی ہلکی سی ترشی نے اس کے ذائقہ کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ جیسے غارے کا خبار عورت کے حسن کو



نکھار دیتا ہے۔ بیکایک اسے سینہ کا خیال آیا۔ سینہ ابھی تک نہ آئی تھی۔ گو اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح کے ناشتہ پر اس کے ساتھ موجود ہوگی۔ سو، ہی ہوگی بیچاری اب کیا دفت ہوگا۔ اس نے اپنی سونے کی گھڑی سے پوچھا جو اس کی گوری کلائی میں جس پر سیاہ بالوں کی ایک ہلکی سی ریشمیں لائین تھی۔ ایک سیاہ ریشمی فیتے سے بندھکا تھی۔ گھڑی، قمیض کے بٹن اور ٹائی کا پن، یہی تین زیور مرد پہن سکتا ہے۔ اور عورتوں کو دیکھئے کہ جسم کو زیور سے ڈھک لیتی۔ کان کے لئے زیور، پاؤں کے لئے زیور، کمر کے لئے زیور، ناک کے لئے زیور سر کے لئے زیور، گلے کے لئے زیور۔ باہوں کے لئے زیور اور مرد بے چارے کے لئے صرف تین زیور بلکہ دو ہی سمجھئے کیونکہ ٹائی کا پن اب فیشن سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ نہ جانے مردوں کو زیادہ زیور پہننے سے کیوں منع کیا گیا ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ دلہا کھانے لگا۔ ولئے سے لالچی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ اس کے نتھنے، اس کے پاکیزہ نعرے مصطفیٰ ہو گئے اور بیکایک اس کے ننھنوں میں گزشتہ رات کے عطر کی خوشبو تازہ ہو گئی۔ وہ عطر جو سینہ نے انہی ساڑھی، اپنے بالوں میں لگا رکھا تھا۔ گزشتہ رات کا دلفریب رقص اس کی آنکھوں کے آگے گھومنا گیا۔ گرانڈ ہوٹل میں ناچ ہمیشہ اچھا ہوتا ہے۔ اس کا اور سینہ کا جوڑا کتنا اچھا ہے۔ سارے ہاں کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں۔

دونوں کانوں میں گول گول طلائی آونیرے پہنے ہوئے تھی۔ جو اس کی ٹوڈا کو چھپا رہے تھے۔ ہونٹوں پر جوانی کا بے بسم اور میکس فیکٹر کی لالی کا معجزہ اور سینے کے سمن زاروں پر مونہیوں کی مالا چمکتی، دکنی، چمکتی ناگن کی طرح سوبل کھاتی ہوئی۔



رہباناج کوئی سینہ سے سکیے، اس کے جسم کی روانی اور ریشمی بنا رسی ساڑی کا پیر شور  
 بہاؤ جیسے سمندر کی لہریں چاندنی رات میں ساحل سے اٹھکھیلیاں کر رہی ہوں۔ لہر  
 آگے آتی ہے۔ ساحل کو چھو کر واپس چلی جاتی ہے۔ مدھم سی سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔  
 اور چلی جاتی ہے۔ شور مدھم ہو جاتا ہے۔ شور قریب آ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ لہر  
 چاندنی میں نہانے ہوئے ساحل کو چوم رہی ہے۔

سینہ کے لب نیم داتھے۔ جن میں دانتوں کی لڑی سپید مونیوں کی مالا  
 کی طرح لرزتی نظر آتی تھی..... پکا پاک وہاں کی بجلی بھجھ گئی۔ اور وہ سینہ سے  
 ہونٹ سے ہونٹ ملائے۔ جسم سے جسم لگائے آنکھیں بند کئے رقص کے تال پر ناچتے  
 رہے۔ ان سروں کی مدھم سی روانی، وہ سیلا میٹھا نمون رواں دواں۔ رواں  
 دواں موت کی سی پاکیزگی۔ نیند اور خمہ اور نشہ جیسے جسم نہ ہو۔ جیسے زندگی نہ ہو۔  
 جیسے تو نہ ہو۔ جیسے میں نہ ہو۔ صرف ایک بوسہ ہو۔ صرف ایک گیت ہو۔ اک لہر  
 ہو۔ رواں دواں، رواں دواں..... اس نے سب کے قتلے  
 کئے اور کانٹے سے اٹھا کر کھانے لگا۔ پیالی میں چائے انڈلیتے ہوئے اس نے سوچا  
 سینہ کا جسم کتنا خوب صورت ہے۔ اس کی روح کتنی حسین ہے۔ اس کا دماغ  
 کس قدر کھوکھلا ہے۔ اسے پر مغز عورتیں بالکل پسند نہ تھیں۔

جب دیکھو اشتراکیت، سامراجیت اور مارکسیت پر بحث کر رہی ہیں۔  
 آزاد سی تعلیم نسواں، نوکری، یہ نئی عورت، عورت نہیں فلسفے کی کتاب ہے۔ بھٹی  
 ایسی عورت سے ملنے یا شادی کرنے کی بجائے تو یہی بہتر ہے کہ آدمی ارسطو پڑھا  
 کرے۔ اس نے بیقرار ہو کر ایک بار سچر گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ سینہ ابھی تک



نہ آئی تھی۔ چرچل اور اسٹالن اور روز ویلٹ طہران میں دنیا کا نقشہ بدل رہے تھے۔  
 اور بنگال میں لاکھوں آدمی بھوک سے مر رہے تھے۔ دنیا کو اطلانتک چارٹر دیا جا رہا  
 تھا۔ اور بنگال میں چاول کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔ اسے ہندوستان کی غربت پر اتنا  
 ترس آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ہم غریب ہیں بے بس ہیں نادار ہیں مجبور  
 ہیں۔ ہمارے گھر کا وہی حال ہے جو تیر کے گھر کا حال تھا جس کا ذکر انہوں نے  
 چوتھی جماعت میں پڑھا تھا۔ اور جو ہر وقت فریاد کرتا رہتا تھا۔ جس کی دیواریں  
 سیلی سیلی اور گری ہوئی تھیں۔ اور جس کی چھت ہمیشہ ٹپک ٹپک کر رہی تھی۔  
 اس نے سوچا ہندوستان بھی ہمیشہ روتا رہتا ہے۔ کبھی روٹی نہیں ملتی، کبھی  
 کپڑا نہیں ملتا۔ کبھی بارش نہیں ہوتی۔ کبھی دبا پھیل جاتی ہے۔ اب بنگال کے  
 بیٹوں کو دیکھو، بڈیوں کے ڈھانچے آنکھوں میں ابدی افسردگی، لبوں پر بھکاری  
 کی صدا، روٹی، چاول کا ایک دانہ یکا یک چائے کا گھونٹ اسے اپنے حلق میں  
 تلخ محسوس ہوا۔ اور اس نے سوچا کہ وہ ضرور اپنے ہم وطنوں کی مدد کرے گا۔ وہ چندہ  
 اکٹھا کرے گا۔ سارے ہندوستان کا دورہ کرے گا۔ اور چیخ چیخ کر اس کے صنمیر  
 کو بیدار کرے گا۔ دورہ، جلسے، والٹیر، چندہ، اناج اور زندگی کی ایک لہر  
 ملک میں اس سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جائے گی۔ برقی رو کی طرح۔ یکا یک  
 اس نے اپنا نام جلی سرخیوں میں دیکھا۔ ملک کا ہر اخبار اس کی خدمات کو سراہ رہا  
 تھا۔ اور خود، اس اخبار میں جسے وہ اب پڑھ رہا تھا۔ اسے اپنی تصویر جھانکتی  
 نظر آئی کھدر کا لباس اور جواہر لال جکیٹ اور ہاں ویسی ہی خوب صورت مسکراہٹ  
 ہاں بس یہ ٹھیک ہے۔ اس نے، میرے کو آواز دی اسے ایک اور آئیٹ لائے کو کہا۔



آج سے وہ اپنی زندگی بدل ڈالے گا۔ اپنی جیات کا ہر لمحہ ان بھوکے  
 ننگے، پیاسے، مرتے ہوئے ہم وطنوں کی خدمت میں صرف کر دیگا۔ وہ اپنی جان  
 بھی ان کے لئے قربان کر دیگا۔ یکایک اس نے اپنے آپ کو پھانسی کی کوٹھری  
 میں بند دیکھا۔ وہ پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔ اس کے گلے میں  
 پھانسی کا پھندا تھا۔ جلاؤ نے چہرے پر غلاف اڑھا دیا۔ اور اس نے اس  
 کھر درے موٹے غلاف کے اندر سے چلا کر کہا۔

”میں مر رہا ہوں۔ اپنے بھوکے پیاسے ننگے وطن کے لئے یہ سوچ کر  
 اس کی آنکھوں میں آنسو پھر بھرا آئے اور دو ایک گرم گرم نمکین بوندیں چائے  
 کی پیالی میں بھی گر پڑیں۔ اور اس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ یکایک  
 ایک کارپورچ میں رکی اور موٹر کا پٹ کھول کر سینہ مسکراتی ہوئی سیڑھیوں  
 پر چڑھتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر آتی ہوئی اسے ہیلو کہتی ہوئی۔ اس کے  
 گلے میں ہاتھیں ڈال کر اس کے رخسار کو پھول کی طرح اپنے عطر بنر ہونٹوں  
 سے چومتی ہوئی نظر آئی، بجلی، گرمی، روشنی، مسرت سب کچھ ایک تبسم میں تھا۔  
 اور چہرہ زہر، سینہ کی آنکھوں میں زہر تھا۔ اس کی زلفوں میں زہر تھا۔ اس  
 کی مدھم ہلکی سانس کی ہر جنبش میں زہر تھا۔ وہ اجنتا کی تصویر تھی۔ جس کے خدو  
 خال تصویر نے زہر سے ابھارے تھے۔

اس نے پوچھا۔ ”ناشتہ کر دو گی۔؟“

”نہیں میں ناشتہ کر کے آئی ہوں۔“ پھر سینہ نے اس کی پلکوں میں

آنسو چھلکتے دیکھے بولی۔



”تم آج اُداس کیوں ہو۔؟“

وہ بولا۔ ”کچھ نہیں۔ یونہی۔ بنگال کے فاقہ کشوں کا حال پڑھ رہا تھا۔  
سینہ۔ ہمیں بنگال کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔“

”DOOR DARLINGS“ سینہ نے آہ بھر کر اور جیسی آئینے کی مدد سے  
اپنے ہونٹوں کی سرخی ٹھیک کرتے ہوئے کہا: ”ہم لوگ ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔  
ماسوا اس کے کہ ان کی روحوں کے لئے پرمانہ سے شانتی مانگیں۔“  
”کانوڈنٹ کی تعلیم بے نا آخر۔؟“ اس نے اپنے خوب صورت سپنہ  
دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

وہ سوچ کر بولا۔

”ہمیں ایک۔۔۔۔۔ ریزولوشن بھی پاس کرنا چاہیے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔؟“

سینہ نے نہایت معصومانہ انداز میں پوچھا اور اپنی ساڑھی کا پلو  
درست کرنے لگی۔

”اب یہ تو مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔“ وہ بولا: ”اتنا ضرور  
جانتا ہوں کہ جب کبھی ملک پر کوئی آفت آتی ہے۔ ریزولوشن ضرور پاس کیا  
جاتا ہے۔ سنا ہے ریزولوشن پاس کر دینے سے سب کام خود بخود ٹھیک ہو  
جاتا ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے۔ بس ابھی ٹیلی فون کر کے شہر کے کسی رہنما سے  
دباغ فن کے بارے میں پوچھتا ہوں۔“



”رہنے بھی دو ڈارنگ۔!“ سینہ نے مسکرا کر کہا۔

”دیکھو، جوڑے میں پھول ٹھیک سجا ہے۔!“

اس نے نیلراج کی نازک ڈنڈی کو جوڑے کے اندر تھوڑا سا دیا دیا۔  
”بے حد پیارا پھول ہے، نیلا جیسے کرشن کا جسم، جیسے ناگ کا پھن جیسے

زہر کا رنگ۔!“

پھر سوچ کر بولا۔

”نہیں کچھ بھی ہو۔ ریزولوشن ضرور پاس ہونا چاہیے۔ میں ابھی ٹیلی

فون کرتا ہوں۔“

سینہ نے اسے اپنے ہاتھ کی ایک ہلکی سی جبینش سے روک لیا۔ گداز  
انگلیوں کا لمس ایک ریشمی رد کی طرح اس کے جسم کی رگوں اور عروق میں پھیلتا  
گیا۔ رواں دواں۔ رواں دواں۔..... اس لہرنے اسے بالکل بے بس کر دیا۔ اور وہ  
ساحل کی طرح بے حس و حرکت ہو گیا۔

”آخری رہنما کتنا اچھا تھا۔!“ سینہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

اور اس کے ذہن میں پھر جیہ نیٹیاں سی رنگنے لگیں۔ بنگالی فاقہ مستوں  
کی قطار میں اندر گھسنی چلی آرہی تھیں۔ وہ انہیں باہر نکالنے کی کوشش میں کامیاب  
ہوا۔ بولا۔

”میں کتنا ہوں سینہ، ریزولوشن پاس کرنے کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

میرے خیال میں اس کے بعد ہمیں فحط زدہ علاقے کا دورہ کرنا چاہیے کیوں؟

”بہت دماغی محنت سے کام لے رہے ہو اس وقت؟“ سینہ نے قدر







”اور تم نے کیا جواب دیا تھا۔؟“ اس نے پوچھا۔  
 ”میں نے انکار کر دیا تھا۔“ سنیہہ نے شرماتے ہوئے کہا۔  
 ”بہت اچھا کیا۔“ وہ بولا۔ ”میں اس وقت شراب کے نشے میں تھا۔“



کار، جیوتی رام، میونی رام، پیونی رام بھوند دل تمباکو فروش کی  
 دوکان پر رکی، سامنے گرانڈ ہوٹل کی عمارت تھی کسی مغلیٰ مقبرے کی طرح وسیع  
 اور بہ شکوہ !

اس نے کہا: ”تمہارے لئے کون سے سگریٹ لے لوں۔؟“  
 ”روز، مجھے اس کی خوشبو پسند ہے۔“ سنیہہ نے کہا۔  
 ”امی دودن کھیتے پانی کی ٹی جھو کھیتے داؤ۔“

ایک بنگالی لڑکا دھوٹی پہنے ہوئے بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے ساتھ  
 ایک چھوٹی سی لڑکی تھی۔ میلی کچیلی، خاک میں ڈٹی ہوئی آنکھیں غلیظ اور  
 ادھ مندی سنیہہ نے کراہیت سے منہ پھیر لیا۔

”میم صاحب ایکٹا پوئے شاداؤ۔“ لڑکا گڑ گڑا رہا تھا۔  
 ”تو میں روز ہی لے آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ جیونی رام۔ میونی رام۔  
 بیونی رام، بھوند دل تمباکو فروش کی دوکان کے اندر غائب ہو گیا۔  
 سنیہہ کار میں بیٹھی لیکن بنگال کی بھو کی لکھیاں اس کے دماغ میں  
 جھن جھناتی رہیں۔ میم صاحب..... میم صاحب..... میم صاحب۔



میم صاحب نے دو ایک بار انہیں جھڑک دیا۔ لیکن بھوک جھڑکنے سے کہاں دور ہوتی ہے۔ وہ اور بھی قریب آ جاتی ہے۔ لڑکی نے درتے درتے اپنے ننھے ننھے ہاتھ سینہ کی ساڑھی سے لگا دیے۔ اور اس کا پلو پکڑ کر لجاجت سے کہنے لگی۔  
 ”میم صاحب..... میم صاحب..... میم صاحب بور دکھیدے پیچھے کی چھو دا۔“

سینہ اب بالکل زچ ہو گئی تھی۔ اس نے جلدی سے پلو چھڑا لیا۔ اتنے میں وہ آگیا۔ سینہ بولی۔

”یہ گداگر کیوں اس قدر پریشان کرتے ہیں۔ کارپوریشن کوئی انتظام نہیں کر سکتی ہے کیا؟..... جب سے تم دوکان کے اندر داخل ہوئے ہو..... یہ.....“

اس نے گداگر لڑکے کو زور سے چپٹ لگایا اور کار گجرا کر گرانڈ ہوٹل کے پورچ میں لے آیا۔

بنگالی لڑکی جو ایک جھٹکے کے ساتھ دوڑ جا پرسی تھی۔ وہیں فرش خاک پر کرا بنے لگی۔ لڑکے نے اپنی چھوٹی بہن کو اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”تمار کو سٹھاؤ لاگے نے تو۔“

لڑکی سسکنے لگی.....



ناچ عروج پر تھا۔

سینیہ اور وہ ایک میز کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے۔

سینیہ نے پوچھا۔ "کتنے روپے اکٹھے ہوئے؟"

"سارے چھ ہزار۔"

"ابھی تو ناچ عروج پر ہے۔ صبح چار بجے تک....."

"تو ہزار روپیہ ہو جائے گا۔" وہ بولا۔

"آج تم نے بہت کام کیا ہے۔" سینیہ نے اس کی انگلیوں کو چھو کر

کہا

"کیا پیو گی؟"

"نہیں کیا پیو گے؟"

"جن اور سوڈا۔"

سینیہ بولی۔ "بیرا۔ صاحب کے لئے ایک لارج جن لاؤ اور سوڈا۔"

"ناچنے ناچنے اور پیتے پیتے پریشان ہو گئی ہوں۔"

"اپنے وطن کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے ڈارلنگ۔" اس نے سینیہ

کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اوہ مجھے امپریلیزم سے کس قدر نفرت ہے۔" سینیہ نے پر خلوص لہجہ

میں کہا۔

"بیرا، میرے لئے ایک درجن لاؤ۔"



بیرے نے "درجن" کا جام لا کر سامنے رکھ دیا۔ جن کی سپیدی میں  
 درموتھ کی لالی اس طرح نظر آتی تھی جیسے سینہ کے عنبریں چہرے پر اس کے  
 لب لعلیں۔ سینہ نے جام ہلایا اور کاک ٹیل کا رنگ شفقتی ہو گیا۔ سینہ نے  
 جام اٹھایا اور بجلی کی روشنی نے اس کے جام میں گھل کر یا قوت کی سی چمک  
 پیدا کر دی۔ یا قوت سینہ کی انگلیوں میں تھرا رہا تھا۔ یا قوت جو خون کی طرح  
 سرخ تھا۔



ناچ عروج پر تھا اور وہ اور سینہ ناچ رہے تھے۔ ایک گت، ایک  
 تال، ایک لے، سمندر دور..... بہت دور..... کہیں نیچے چلا گیا تھا۔ اور  
 زمین گم ہو گئی تھی۔ اور وہ ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اور سینہ کا چہرہ اس کے کندھے  
 پر تھا اور سینہ کے بالوں میں بسی ہوئی خوشبو اسے بلا رہی تھی۔ بال بنانے کا  
 انداز کوئی سینہ سے سیکھے۔ یہ عام ہندوستانی لڑکیاں تو بیچ میں سے یا  
 ایک طرف مانگ نکال لیتی اور تیل چھڑ کر بالوں میں کنگھی کر لیتی ہیں۔ بہت  
 ہوا تو دو چوڑیاں کر ڈالیں۔ اور اپنی دالنت میں فیشن کی شہزادی بن بیٹھیں  
 مگر یہ سینہ ہی جانتی ہے کہ بالوں کی ایک الگ سستی ہوتی ہے۔ ان کا اپنا  
 حسن ہوتا ہے۔ ان کی مشاطگی عورت کی لسانیت کی معراج ہے۔ جیسے کوئی  
 مصور سادہ تختے پر حسن کے نازک خطوط کھینچتا ہے۔ اسی طرح سینہ بھی  
 اپنے بال سنوارتی تھی کبھی اس کے بال کنول کے پھول بن جاتے کبھی کانوں



پر ناگن کے پھین۔ وہ کبھی چاند کا ہالہ ہو جاتے کبھی ان بالوں میں ہمالیہ کی  
واوٹیوں کے سے نشیب و فراز پیدا ہو جاتے۔ سینہ اپنے بالوں کی آرائش میں  
ایسے جمایا فانی ذوق اور جودتِ طبع کا ثبوت دیتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا۔ سینہ  
کی عقل اس کے دماغ میں نہیں، اس کے بالوں میں ہے.....!



ناچ عروج پر تھا اور یہ بال اس کے رخساروں سے مس ہو رہے  
تھے۔ اس کے رگ و پے میں رقص کی روانی تھی۔ اور اس کے تھنوں میں اس  
خوشبو کا عطر اس کا جسم اور سینہ کا جسم گھل کر ایک ہو گئے تھے۔ اور ایک  
شعلے کی طرح ساز کی دھن پر لہرا رہے تھے۔ ایک شعلہ، ایک پھین، ایک زہر  
..... ایک لہر..... لہریں..... لہریں، ہلکی ہلکی، گرم مدور سی لہریں ساحل  
کو چومتی ہوئی۔ لوریاں دیکر تھپک تھپک کر سلاتی ہوئی سو جاؤ، موت میں  
زندگی ہے۔ حرکت نہ کرو۔ سکون میں زندگی ہے۔ آواز نہ طلب کرو۔ غلامی  
ہی زندگی ہے۔ چاروں طرف ہال میں ایک میٹھا سا زہر سا ہوا تھا۔ شراب  
میں..... عورت میں..... ناچ میں..... سینہ کے نیلے سائے میں۔ اس  
کے پراسرار تنہم میں، اس کے نیم والیوں کے اندر کانپتی ہوئی موتیوں کی  
لڑھی میں، زہر..... زہراور نمید اور سینہ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے، بند  
ہوتے ہوئے لب، اور نغمے کا زہر، سو جاؤ..... سو جاؤ..... سو جاؤ۔  
..... یکا یک بال میں بجلی بھج گئی۔ اور وہ سینہ کے ہونٹوں سے ہونٹ



ملائے۔ اس کے جسم سے جسم لگائے۔ مدھم مدھم دھیمے دھیمے ہوئے ناچ کے  
جھولے میں گہرے، گداز، گرم آغوش میں کھو گیا۔ بہہ گیا۔ سو گیا، مر گیا۔

(۳)

## وہ آدمی جو ابھی زندہ ہے

..... میں مر چکا ہوں۔؟ میں زندہ ہوں۔؟..... میری کھٹی کھٹی  
بے نور بے بھر آنکھیں آسمان کی پہنائیوں میں کسے ڈھونڈ رہی ہیں۔؟ آؤ پل بھر  
کے لئے اس قونصل خانے کی سٹرچیوں پر بیٹھ جاؤ اور میری داستان سنتے جاؤ۔  
جب تک پولیس، سیوا ستمی، یا انجمن خدام المسلمین میری لاش کو یہاں سے اٹھا  
نہ لے جائیں۔ تم میری داستان سن لو نفرت سے منہ پھرو۔ میں کبھی تمہاری طرح  
گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہوں۔ یہ سچ ہے کہ اب میرے جسم پر گوشت کم  
اور پوست زیادہ نظر آتا ہے۔ اور اس میں بھی سڑاند پیدا ہو رہی ہے اور ناک  
سے پانی کے جیلے سے اٹھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تو سائینس کا ایک معمولی سا عملیہ  
ہے۔ تمہارے جسم اور میرے جسم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے دل کی حرکت



بند ہو گئی ہے۔ دماغ نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور پیٹ ابھی تک بھوکا ہے۔ یعنی اب بھی اس قدر بھوکا ہے کہ میں سوچتا ہوں۔ اگر تم چاول کا ایک ہی دانہ میرے پیٹ میں پہنچا دو تو وہ پھر سے کام شروع کر دے گا۔ آزما کر دیکھ لو۔ کدھر چلے۔ ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو نہ جاؤ۔ میں تو یوں ہی مذاق کر رہا تھا۔ تم گھبرا گئے کہ کلکتہ کے مردے بھی بھیک مانگتے ہیں۔؟ خدا کے لئے نہ جاؤ۔ میری داستان سن لو۔ ہاں ہاں اس چاول کے دانے کو اپنی مٹھی میں سنبھال کر رکھو۔ میں اب تم سے بھیک نہیں طلب کروں گا۔ کیونکہ میرا جسم اب گل چکا ہے۔ اسے چاول کے دانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب یہ خود ایک دن چاول کا دانہ بن جائیگا۔ نرم نرم گداز مٹی میں جس کے ہر مسام میں ندی کا پانی رچا ہو گا۔ یہ جسم گھل جائے گا۔ اپنے اندر دھان کی پیزی اگتے ہوئے دیکھے گا۔ اور پھر یہ ایک دن پانی کی تیلی تہہ سے اوپر نرکال کر اپنے سبز سبز خوشوں کو ہوا میں لہرائیگا۔ مسکرائے گا۔ ہنسے گا۔ کھلکھلائے گا۔ کرنوں سے کھیلے گا۔ چاندنی میں نہائے گا۔ پسندوں کے چھپوؤں اور خنک ہوا کے جھونکوں کے شہد آئیں بوسوں سے اسکی حیات کے بند بند میں ایک نئی رعنائی ایک نیا حسن، ایک نیا نغمہ پیدا ہو گا۔ چاول کا ایک دانہ ہو گا۔ صدف کے موتی کی طرح اجلا، معصوم اور خوب صورت۔۔۔۔۔ آج میں تم سے ایک راز کی بات کہتا ہوں۔ دنیا کا سب سے بڑا راز، وہ راز جو تمہیں ایک مردہ ہی بنا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا سے دھا کرو۔ وہ تمہیں انسان نہ بنائے۔ چاول کا ایک دانہ بنادے۔ گو زندگی انسان میں بھی ہے اور چاول کے دانے میں بھی۔ لیکن جو زندگی۔ چاول کے دانے میں ہے۔ وہ انسان کی زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ خوب صورت ہے۔



پاک ہے اور انسان کے پاس بھی اس زندگی کے سوا اور ہے کیا۔  
 انسان کی جائیداد اس کا جسم، اس کا باغ اس کا گھر نہیں بلکہ یہی اس  
 کی زندگی ہے۔ اس کا اپنا آپ، وہ ان سب چیزوں کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے  
 اپنے جسم کو، اپنی زمین کو، اپنے گھر کو اس کے دل میں چند تصویریں ہوتی ہیں۔ چند خیال  
 آگ کے چند انگارے ایک مسکراہٹ وہ ان ہی پر جیتا ہے۔ اور جب مرجاتا ہے تو صرف  
 انہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔

چاول کے دانے کی زندگی تم دیکھ چکے۔ اب آؤ، میں تمہیں اپنی زندگی دکھاؤں  
 نفرت سے منہ نہ پھیر لو۔ کیا ہوا؟ اگر میرا جسم مردہ ہے۔ میری روح تو زندہ ہے۔ میری  
 روح تو بیدار ہے اور بیشتر اس کے کہ وہ بھی سو جائے، وہ تمہیں ان چند دنوں کی  
 کہانی سنانا چاہتی ہے۔ جب روح اور جسم ایک ساتھ چلتے پھرتے ناچتے گاتے  
 مہنتے بولتے تھے۔ روح اور جسم، دو میں مرا ہے۔ دو میں حرکت ہے۔ دو میں زندگی ہے۔  
 دو میں تخلیق ہے۔ جب دھرتی اور پانی ملتے ہیں تو چاول کا دانہ پیدا ہوتا ہے۔

جب عورت اور مرد ملتے ہیں تو ایک خوبصورت ہنستا ہوا بچہ ظہور میں  
 آتا ہے۔ جب روح اور جسم ملتے ہیں تو زندگی پیدا ہوتی ہے۔ آؤ تمہیں اپنے دو کی داستان  
 جب جسم الگ ہو جاتا ہے تو اس میں سڑاند پیدا ہوتی ہے اور جب روح الگ ہوتی  
 ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے۔ اگر عورت سے دیکھو گے تو تمہیں اس دھوئیں میں  
 میرے ماضی کی نسا ویریزی، دکھتی، گم ہوتی ہوئی نظر آئیں گی..... یہ تجلی کیا تھی۔  
 ..... یہ میری بیوی کی مسکراہٹ تھی..... یہ میری بیوی ہے..... بشر آؤ تمہیں  
 سامنے آ جاؤ، اے جان تمنا..... اسے دیکھا آپ نے؟ یہ سالوں کی سلونی موت



یہ گھنے بال کرتک لہراتے ہوئے۔ یہ شرمیلا تبسم۔ یہ جھکی جھکی جبران جبران آنکھیں۔ یہ آج سے تین سال پہلے کی لڑکی ہے۔ جب میں نے اسے اپنا پارا کے ساحلی گھاؤں میں سمندر کے کنارے دوپہر کی سوئی ہوئی فضا میں دیکھا تھا..... میں ان دنوں اجاڑ قصبے میں زمیندار کی لڑکی کو ستار سکھاتا تھا۔ اور یہاں اپنا پارا میں دودن کی چھٹی لیکر اپنی بڑی موسیٰ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ یہ خاموش گھاؤں سمندر کے کنارے بالٹیوں کے حصیڈ اور ناریل کے درختوں سے گھرا ہوا اپنی ادا اسی میں گم تھا۔ نہ جانے ہمارے بنگالی گھاؤں میں اتنی ادا اسی کہاں سے آجاتی ہے۔ بالٹس کے چھپروں کے اندر اندر ہے سبیلن ہے۔ بالٹس کی ہانڈیوں میں چاول و بے پڑے ہیں۔ جھلی کی بو ہے۔ تالاب کا پانی کافی سے سبز ہے۔ وہاں کے کھیتوں میں پانی ٹھہرا ہوا ہے۔ ناریل کا درخت ایک نکلی برچی کی طرح آسمان کے سینے میں گہرا گھاؤ ڈالے کھڑا ہے۔ ہر جگہ ہر وقت درد کا احساس ہے۔ ٹھہراؤ کا احساس ہے۔ حزن کا احساس ہے۔ سکون۔ جمود اور موت کا احساس ہے۔ یہ ادا اسی جو تم ہماری محبت، ہماری سماج ہمارے ادب اور نغمے میں دیکھتے ہو۔ یہ ادا اسی ہمارے گھاؤں سے شروع ہوتی ہے اور پھر ساری دھرتی پر پھیل جاتی ہے۔ جب میں نے اسے پہلے پہل دیکھا تو یہ مجھے ایک جل پری کی طرح حسین نظر آئی۔ یہ اس وقت پانی میں تیر رہی تھی۔ اور میں ساحل کی ریت پر پھل رہا تھا۔ اور ایک نئی دھن میں سوچ رہا تھا۔ یکایک میرے کانوں میں ایک شیریں نسوانی آواز سنائی دی۔

”پرے ہٹ جاؤ، میں کنارے پر آنا چاہتی ہوں۔“

میں نے دیکھا آواز سمندر میں سے آرہی تھی۔ لانے رہیں گھنے بال اور



جل پر سی کا چہرہ ہنستا ہوا مسکراتا ہوا اور دور پرے افق پر ایک کشتی جس کا ٹیالا  
باد بان دھوپ میں سونے کے تپڑے کی طرح چمکتا نظر آ رہا تھا۔  
میں نے کہا۔ ”کیا تم سات سمندر پار سے آئی ہو۔؟“  
وہ ہنس کر بولی۔

”مہنیں میں تو اسی گاؤں میں رہتی ہوں۔ وہ کشتی میرے باپ کی ہے۔ وہ  
مچھلیاں مکڑ رہا ہے۔ میں اس کے لئے کھانا لاتی ہوں۔۔۔۔۔ ذرا دیکھ کر چلو۔ تمہارے  
قریب نارمل کے تنے کے پاس کھانا رکھا ہے۔ اور وہاں میری سارٹھی بھی ہے۔“  
یہ کہہ کر اس نے پانی میں ایک ڈبھی لگائی اور پھر لہروں میں چھوٹتے ہوئے  
بلبلوں کی افشاں سی بناتی ہوئی کنارے کے قریب آگئی۔ بولی۔  
”پرے ہٹ جاؤ اور وہ دھوئی مجھے دیدو۔“

میں نے کہا۔

”ایک شرط پر۔“

”کیا ہے۔؟“

”میں بھی مچھلی سہات کھاؤں گا۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

وہ ہنسی اور پھر سن سے ایک نیر کی طرح پانی کے سینے کو چرتی ہوئی دور  
چلی گئی۔ جہاں اس کے چاروں طرف سورج کی کرنوں نے پانی میں طلائی جال بنا رکھا  
تھا۔ اور اس کا نازک چہرہ میا سبک اندام جسم اک نئی کشتی کی طرح ان پانیوں میں  
گھومتا نظر آیا۔ پھر وہ گھومی اور سیدھی کنارے کو ہوئی۔ لیکن اب ہولے ہولے آرہی  
تھی۔ آہستہ آہستہ، دگدگ دگدگ۔۔۔۔۔



میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔؟“

بولی۔ ”آج کل سبھات بہت مہنگا ہے۔ روپے کا دوسیر ہے۔ میں

تمہیں سبھات نہیں کھلا سکتی۔“

”پھر، میں کیا کروں۔ مجھے تو بھوک.....“

”سمندر کا پانی پیو۔“ اس نے شوخی سے کہا۔ اور پھر ایک ڈبکی لگائی۔

• • •

جب وہ پیری بوسی بن کر میرے گھر آئی تو سبھات روپے کا دوسیر تھا۔ اور میری خواہ

پچاس روپے ماہانہ تھی۔ بیاہ سے پہلے مجھے خود صبح اٹھ کر سبھات پکانا پڑتا تھا۔ کیونکہ

زمیندار کی بیٹی اسکول جاتی تھی۔ اور مجھے علی الصبح اسے ستار سکھانے کے لئے جانا پڑتا

تھا۔ شام کو بھی اسے دو گھنٹے تک ریاض کرانا تھا۔ دن میں بھی زمیندار بلا لیتا تھا۔

”ستار سناؤ جی۔ جی بہت ادا ہے۔؟“

پھر یہ نہیں سہی۔ جی ہمارے ہاں آگئی..... ادھر آؤ بیٹیا.....

ہاں مسکرا دو۔ منس پڑو۔ ان سے کہہ دو میں بالکل معصوم ہوں انجان ہوں میری

عمر دو سال کی بھی نہیں اور مجھے جھنجھنا بجاتے، گرہ یا سے کھیلنے اور ماں کی چھاتی سے

لگ کر دودھ پینے اور دودھ پینے پیتے اس کے سینے سے اپنے منے ہاتھ چٹائے

اس گداز آغوش میں سو جانے کا بہت شوق ہے۔ میں اتنی پاکیزہ ہوں کہ خود بول

بھی نہیں سکتی۔ بات بھی نہیں کرتی، صرف مڑ مڑ نکلتی ہوں۔ اس آسمان کی طرف



جس کے مالک نے مجھے اس زمین پر بھیجا ہے۔ کہ میں اپنے باپ کے دل میں انسانی مسرت کی کرن بکھیر رہوں اور بالنس کی سیلی سیلی چھیر یا میں خوشی کا گیت بن کر گھر کے آنگن کو اپنی ہنسی کے راگ سے بھر دوں..... مسکرا دو بیٹیا!۔

ہاں تو جب یہ ننھی سی بچی پیدا ہوئی۔ اس وقت بھات روپے کا ایک سیر تھا۔ لیکن ہم لوگ اس پر بھی خدا کا شکر بجالاتے تھے۔ جس نے چاول کے دانے بنائے اور زمیندار کے پاؤں چومتے تھے، جس نے ہمیں چاول کے دانے کھلائے اور سچ بات تو یہ ہے کہ بنائے اور کھانے کے بیچ میں چیز حاصل ہے۔ وہ بجائے خود ایک پوری مازنج ہے۔ انسانی زندگی کے ہزاروں سال کی داستان ہے۔ اس کی تہذیب و تمدن، مذہب اور اہم فلسفہ اور ادب کی تفسیر ہے۔ بنانا اور کھانا بہت سہل الفاظ ہیں۔ لیکن ذرا اس گہری خلیج کو بھی دیکھیے۔ جو ان دو لفظوں کے درمیان حایل ہے۔



بھات روپے کا ایک سیر تھا۔  
 پھر بھات روپے کا تین پاؤ ہوا۔  
 پھر بھات روپے کا آدھ سیر ہوا۔  
 پھر بھات روپے کا ایک پاؤ ہوا۔  
 اور — پھر بھات معدوم ہو گیا۔  
 پھر درختوں پر سے آم، جامن، کیل، شریفیہ، کیلے ختم ہو گئے۔  
 تاڑی ختم۔ ساگ سبزی ختم۔ مچھلی ختم۔ مارلی ختم۔ کہتے ہیں زمیندار کے پاس منوں



انا ج تھا۔ اور بننے کے پاس بھی لیکن کہاں تھا کس جگہ تھا کسی کو معلوم نہ تھا۔ اناج حاصل کرنے کی سب تدبیریں رائیگاں گئیں۔ گرہ گرا نا۔ منٹیں کرنا۔ خدا سے دعا مانگنا۔ خدا کو دھمکی دینا۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ صرف اللہ کا نام باقی تھا یا زبیدار اور بننے کا گھر اناج کی گرائی دیکھ کر زبیدار نے میرا سنا سکھانا بند کر دیا۔ جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں اس وقت نعرہ کی کسے سوچھتی ہے۔ پچاس روپے دیکر سنا کون سیکھتا ہے۔ بھوک، ناامیدی اور ملکیتی ہوئی بچی۔!

میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

"ہم کلکتہ چلیں گے۔ وہاں لاکھوں لوگ بستے ہیں۔ شاید وہاں کوئی کام

چل جائے۔!"

"چلو کلکتہ چلو۔!"

"چلو کلکتہ چلو۔!" جیسے یہ صداسارے گاؤں والوں نے سن لی گاؤں کی سماجی زندگی اک بند کی طرح مضبوط ہوتی ہے۔ یکایک "چلو کلکتہ چلو" کی صدانے اس بند کا ایک کنارہ توڑ دیا۔ اور سارا گاؤں اس سوراخ کے راستہ سے بہہ نکلا۔

"چلو کلکتہ چلو۔....." ہر لب پر یہی صدا تھی..... چلو کلکتہ چلو.....!"

سیکڑوں، ہزاروں آدمی اس سڑک پر چل رہے تھے۔ یہ سڑک جو کلکتہ کے مضافات میں سے بنگال کے دور دور پھیلے ہوئے گاؤں میں سے گھومتی ہوئی آ رہی تھی۔ یہ سڑک جو ان انسانوں کے لئے شہ رگ کی طرح تھی۔

چلو کلکتہ چلو..... چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ خاک و خون میں اٹی

ہوئی۔ لتھڑی ہوئی اور کلکتہ کی لاش کی طرف جا رہی تھیں۔ ہزاروں، لاکھوں کی



تعداد میں۔ اور اس قافلے کے اوپر گدھ گھوم رہے تھے۔ اور ساری فضا میں مردہ گوشت کی بو تھی۔ چھپیں تھیں۔ فضا میں، آہ دہکا اور آنسوؤں کی سیلن اور لاشیں جو سڑک پر طاعون زدہ چوہوں کی طرح بکھری پڑی تھیں۔ لاشیں جنہیں گدھوں نے کھا لیا تھا۔ اور اب ان کی ہڈیاں دھوپ میں چمکنی نظر آتی تھیں۔ لاشیں جنہیں گدھوں نے کھا لیا تھا۔ لاشیں جنہیں کتے ابھی تک کھا رہے تھے۔ لیکن چیونٹیاں آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔ یہ چیونٹیاں بنگال کے ہر حصے سے بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ اور ان کے ذہن میں مملکت کی لاش تھی۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال کیسے ہوتا۔ ان لاکھوں دیو میں سے ہر شخص اپنے لئے لڑ رہا تھا۔ جی رہا تھا۔ مرد ہاتھ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ شاید ایسا ہی ہونا تھا۔ ان لوگوں کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ ان ہزاروں لاکھوں چیونٹیوں کی موت، پیٹ میں بھوک کا دوزخ اور آنکھوں میں یاسیت کی ہیب تاریکی لئے۔ یہ انسانی چیونٹیاں اپنے بوجھل قدموں سے سڑک پر چل رہی تھیں۔ رڑ رہی تھیں۔ کرا رہی تھیں۔ مر رہی تھیں۔ کاش ان انسانوں میں چیونٹیوں کا سا ہی نظم و نسق ہوتا تو بھی یہ صورتِ حال نہ ہوتی۔ چیونٹیاں اور چوہے بھی اس پر ہی طرح نہیں مرتے۔

راستہ میں کہیں کہیں خیرات بھی مل جاتی تھی۔ ہندو ہندوؤں کو۔ اور مسلمان مسلمانوں کو خیرات دیتے تھے۔ لیکن خیرات سے کب کسی کا پیٹ بھرتا ہے خیرات تو زندگی عطا نہیں کرتی۔ خیرات ہمیشہ دھوکا دیتی ہے۔ خیرات کرنے والے کو بھی آخرت لینے والے کو بھی ہمیں بھی خیرات ملی اور ایک دن ایک سالم نارمل ہاتھ لگ گیا۔ بچی کب سے دودھ کے لئے چلا رہی تھی۔ اور ماں کی چھاتیوں اس دھرتی کی طرح تھیں



بس پر مدت سے پانی کی ایک بوند برسی ہو۔ اس کا پھول سا جسم جھلس گیا تھا۔ وہ بار بار بچی کو پچکارنے کے لئے اس کے ہاتھ میں جھنجھنا دے دیتی۔ بچی کو یہ جھنجھنا بہت پسند تھا۔ وہ اسے ہر وقت کلیجے سے لگائے رکھتی۔ اس وقت بھی وہ اس جھنجھنے کو زور سے اپنی مٹھی میں دبائے اپنی ماں کے شانے سے لگی بلک رہی تھی۔ اور روئے جاتی تھی۔ جیسے کوئی بے بس زخمی جانور برابر چبھنے جاتا ہے۔ اور جب تک اسے موت نہیں آتی برابر اسی طرح، اسی انداز میں، اسی لئے میں بین کئے جاتا ہے..... لیکن اچھا ہوا عین اسی روز ہمیں ایک سالم نارمل مل گیا۔ نارمل کا دودھ ہم نے بچی کو پلایا اور نارمل ہم دونوں نے کھایا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے سارا جہان جی اٹھا ہو۔



اب کسی کے پاس کچھ نہ تھا۔ سب تجارت ختم ہو چکی تھی — صرف گوشت پوست کی تجارت ہو رہی تھی۔ اس کے تاجر شمالی ہند سے آتے تھے۔ ان میں یتیم خانوں کے منیجر تھے جنہیں یتیموں کی تلاش تھی۔ ماں باپ اپنے بہنے منے بچے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے حوالے کر کے انہیں یتیم نہا رہے تھے۔ دراصل غربت ہی تو یتیم پیدا کرتی ہے۔ ماں باپ کا زندہ رہنا یا مر جانا ایک خدائی امر ہے۔ ان تاجروں میں دھوا آشرموں کے کارکن بھی تھے۔ اور خالص تاجر جو ہر قسم کی اخلاقی مذہبی، تمدنی ریاکاری سے الگ ہو کر خالص تجارت کرتے تھے۔ نوجوان لڑکیاں، بکریوں کی طرح ٹٹولی جاتی تھیں۔

مال اچھا ہے۔



رنگ کالا ہے۔

ذرا ادبلی ہے۔

منہ پر چھپک ہے۔

ارے اس کی تو بالکل ہڈیاں نکل آئی ہیں۔

چلو۔ خبیر، ٹھیک ہے۔

وس رہے دیدو۔

خاوند بیویوں کو، مائیں لڑکیوں کو، بھائی بہنوں کو فردخت کر رہے تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو اگر کھانے پیتے ہوئے تو ان تا جروں کو جان سے مار دینے پر تیار ہو جاتے لیکن اب یہی لوگ نہ صرف انہیں بیچ رہے تھے۔ بلکہ سچیتے وقت خوشامد بھی کرتے تھے۔ دوکاندار کی طرح اپنے مال کی تعریف کرتے۔ گڑا گڑاتے۔ جھگڑا کرتے۔ ایک ایک پیسے کے لئے مر رہے تھے۔

مذہب، اخلاقیات، ماننا، زندگی کے قوی سے قوی ترین جذباتوں کے بھی چھلنے اتر گئے تھے۔ اور نسلی بھوک کی پیاسی خوشخوار زندگی منہ بھاڑے سامنے کھڑی تھی۔

میری بیوی نے کہا۔

"ہم بھی اپنی بچی بیچ دیں۔"

ڈرتے ڈرتے، شرمندہ، تجویب ہی ہو کر اس نے یہ الفاظ کہے اور پھر

فوراً ہی چپ ہو گئی۔ اس نے کندکعبیوں سے میری طرف دیکھا۔ جیسے وہ اپنے الفاظ کے غازیانوں کا اثر دیکھ رہی ہو۔ اس کی نگاہوں میں ایک ایسا احساس جرم تھا۔ جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بچی کا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔ جیسے اس نے اپنے



خاوند کو زنگا کر کے اس کے بدن پر کھڑے لگا دیے ہوں۔ جیسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے پھانسی کا سچا تیار کیا ہو اور اب اس کی دہلی پٹلی گردن اس میں لٹک رہی ہو۔

مجھے یہ لگتا نہیں کہ وہ کیوں مر گئی۔ مرنے کو تو وہ اسی وقت مر گئی تھی جس وقت اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ شاید ان الفاظ کے زبان تک آنے سے بہت عرصہ پہلے ہی وہ مر چکی تھی لیکن اب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ غور کرنے پر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلا کیونکر ہوا؟

کس بھیانک قوت نے اس کی مانتا کو مار دیا تھا۔ اس کی روح کو کچل دیا تھا جیسا کہ میں نے ابھی کہا۔ مجھے اس کے مرجانے کا مطلق افسوس نہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اس کی مانتا کیوں مر گئی۔ وہ مانتا جسے سب لازوال کہتے ہیں۔۔۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے اس وقت اپنی کچی کو چھین کر اپنے سینے سے لپٹا لیا تھا۔ میں نے خشکیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اسی طرح لاعلمی کے انداز میں میرے غم و غصہ کو نظر انداز کرتی ہوئی۔ لنگڑاتی ہوئی۔ میرے پیچھے آ رہی تھی۔ کوہو کے اندھے بیل کی طرح۔ اس کے پریشان بال دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ جسم پر دھوئی تار تار ہو چکی تھی۔ دائیں پاؤں کے زخم سے خون رستا تھا۔ اور وہ آنکھیں ————— بائے وہ جل پر ہی کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ سمندر میں طلائی مچھلی کی طرح تیرنے والی سبک اندام بندگالی دوشیزہ ————— وہ پھول کا ساحل جس میں تاج کا مرمر، ایلورا کے مندروں کی رعنائی اور استوک کے کبتوں کی ابدیت کھلی ہوئی تھی۔ آج کدھر غائب ہو گیا تھا۔ کس لئے یہ حسن



یہ مانتا۔ یہ روح اس سڑک پر اک روندی ہوئی لاش کی طرح پڑی تھی۔ اگر یہ سچ ہے کہ عورت ایک اعتقاد ہے۔ ایک معجزہ ہے، زندگی کی سچائی ہے۔ اس کی منزل اس کا مستقبل ہے تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اعتقاد، یہ سچائی۔ یہ معجزہ چاروں کئے دانے سے اگتا ہے۔ اور اس کے نہ ہونے سے مرجاتا ہے۔

جل پر مانی میری گود میں دم توڑ دیا۔ وہ تھکی ماندی، خاک میں الٹی ہوئی اسی سڑک کے کنارے سو گئی۔ میری آغوش میں، دو تین ہچکیاں لہیں۔ اور سانس غائب ————— نہ جانے میرے احساسات کیوں مجھے اس لمحہ کی طرف گھسیٹ کر لے گئے۔ جب میں نے پہلی بار اس کے ہونٹوں کو چوما تھا۔ اور اس کی ہلکی ہوئی سانس نے مجھے سگندہ راج کے پھولوں کی یاد دلادی تھی۔ اس وقت بھی وہی سگندہ راج کے پھولوں کی ہلک تیزی سے میرے ناستوں میں گھستی چلی آئی۔ اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور میں اس کے مردہ لبوں کی طرف تکیے دگا۔ اور میرے آنسو، اس کے لبوں پر اس کی آنکھوں پر اس کے رخساروں پر گرنے لگے۔

وہ میری گود میں مری پڑی تھی۔ جل پر مانی جو انیس سال کی عمر میں مری۔ خاک میں الٹی ہوئی، سنگی بھو کی پیاسی جل پر مانی چڑیل بن کر مری۔ مجھے موت سے کوئی شکوہ نہیں۔ اپنے خدا سے کوئی شکایت نہیں۔ زندگی سے، سڑک پر گزرتے ہوئے اندھے قافلے سے کسی سے کوئی بھی شکایت نہ تھی۔ صرف یہی جی چاہتا تھا کہ وہ اس طرح نہ مرجاتی۔ میں ایک بندے کی طرح نہیں۔ ایک دوست کی طرح اپنے خداؤں سے پوچھنا چاہتا ہوں، اس میں کیا برائی تھی۔ اگر وہ زندہ



رہتی۔ ایک طبعی عمر بسر کرتی۔ اس کا ایک چھوٹا سا گھر ہوتا۔ اس کے بال بچے ہوتے۔ وہ ان کی پرورش کرتی۔ اسے اپنے خاندان کی محبت میسر ہوتی۔ ایک عام اوسط زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں دنیا کر وڑوں ایسے معمولی چھوٹے آدمیوں سے بھر سی پڑی ہے جو زندگی سے ان چھوٹی چھوٹی مسرتوں کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔ نہ سلطنت نہ شہرت پھر بھی اسے یہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں حاصل نہ ہوئیں۔ وہ کیوں اس طرح مر گئی اور اگر اسے مرنا ہی تھا تو وہ ساحل سمندر اور ناریل کے جھینڈ کو دیکھ کر ہی مرتی۔ یہ کیسی موت ہے کہ ہر طرف دیرانی ہے۔ اور لاشیں ہیں۔ اور خلا ہے اور آہ دہکا ہے۔ سڑک کی خاک ہے۔ اور چپ چاپ چلتے ہوئے قدموں کی چاپ ہے اور ————— اور دور کہیں کتے رو رہے ہیں۔

میں نے اسے دفن نہیں کیا۔ میں نے اسے جلا یا بھی نہیں ————— میں نے اسے وہیں سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ اور اپنی بچی کو اپنی چھپائی سے چھپائے آگے بڑھ گیا۔



ابھی کلکتہ دور تھا۔ اور میری بچی بھڑکی تھی۔ وہ اب رد بھی نہ سکتی تھی۔ اس کے گلے سے آواز نہ نکلتی تھی۔ وہ بار بار اپنا منہ ایسے کھولتی جیسے مچھلی جل سے باہر نکل کر پانی کے گھونٹ کسے لئے اپنے ہونٹ وا کرتی ہے۔ ہائے یہ نہیں سہی جل پر ہی اپنے چھوٹے سے کھلنے کو اپنے سینے سے چھپائے ایک گھلتی ہوئی شمع کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ختم ہو رہی تھی۔ بجھ رہی تھی۔



اور میں چلا جا رہا تھا۔ میرے ارد گرد، آمنے سامنے آگے پیچھے اور لوگ بھی تھے  
 رواں دواں مردوں کا قافلہ ہر ایک کی اپنی دنیا تھی۔ لیکن ہر فرد اسی موت کی  
 وادی میں سے گزر رہا تھا۔ اور آنکھوں میں چہروں پر جسموں پر اسی مہیب کا  
 سایہ منڈلا رہا تھا۔ جو اس وادی کی خالق تھی۔ میں ہاتھ جوڑ کر دعا مانگنے لگا۔  
 اے خالقِ ارض و سما اس معصوم بچی کی طرف دیکھ — کیا  
 تیرے دربار میں اس کے لئے دودھ کی ایک بوند بھی نہیں۔ اُن داتا —  
 دیکھ یہ کس طرح یا رب ہاتھ کھولتی ہے۔ بے قرار ہوتی ہے۔ اور ٹرپ کر رہ جاتی ہے۔  
 اے خداوندِ لائزال، تو نے خوب صورت موت بنائی ہے۔ لیکن یہ موت  
 تو خوب صورت نہیں۔ یہ موت تو معصوم نہیں۔ یہ موت تو اس ننھی سی جان کے  
 لائق نہیں۔

سن لے اے کائنات کی پراسرار مخفی قوتِ عظیم — اے  
 خداؤں کے ظالم صدرِ اعظم — تو اس خوب صورت کلی کو ابھی سے  
 کیوں کچل کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اس کی تمنائوں کی دنیاؤں کو دیکھ —  
 سمندر میں بیلوں کی افشاں سبک خرام کشتی، ایک نغمہ اپنے معراج کو پہنچا ہوا  
 تاریل کے حصّہ میں عورت اور مرد کا پہلا بوسہ — کینے، سفلی، ذلیل۔!  
 لیکن نہ دعائیں کام آئیں نہ گالیاں اور میری بچی بھی مر گئی۔ کس طرح  
 ٹرپ ٹرپ کر اس نے جان دی۔ اس کا کرب اور زیادہ میری ان تنہا ٹی سائن  
 دجاہد، بے نور، بے لہر آنکھوں سے پوچھو۔ وہ دودھ کی ایک بوند کے لئے مر گئی  
 وہ بوند جو نہ آسمان سے برسی نہ زمین نے اگلی، بے حس آسمان، بے حس زمین اور



یہ ظالم سڑک۔

مرنے سے کچھ عرصہ پہلے میری بچی نے اپنا پیارا جھنجھنا مجھے دیدیا۔ دیکھو  
ایسا بھی میری مٹھی میں دبا پڑا ہے۔ یہ امانت اس نے میرے حوالے کی تھی۔ نہیں  
نہیں، یہ جھنجھنا اس نے مجھے بخش دیا تھا۔ لا پرواہی کے ساتھ۔ ایک ایسے محسوس  
انداز میں اس نے اسے میرے حوالے کر دیا تھا کہ مجھے یقین ہو گیا۔ کہ اس نے مجھے  
بخش دیا۔ مجھے معاف کر دیا ہے۔ مجھے اپنے لطف و عنایت سے مالا مال  
کر دیا ہے۔ اس نے وہ جھنجھنا میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اور پھر میری گود  
میں مر گئی۔

یہ ایک لکڑی کا جھنجھنا ہے۔ لیکن میرا اعتقاد ہے کہ اگر وہ کلیو پڑا  
ہوئی تو اپنی محبت مجھے بخش دیتی۔ اگر دیکھو یہ ہوئی تو اپنی سلطنت میرے سپرد  
کر دیتی۔ اگر ممتاز محل ہوئی۔ تو تاج محل میرے حوالے کر دیتی۔

لیکن وہ ایک غریب ننسی لڑکی تھی۔ اور اس کے پاس عرف یہی ایک  
لکڑی کا چھوٹا سا جھنجھنا تھا۔ جو اس نے اپنے غریب نادار ابا کے حوالے کر دیا۔  
تم میں سے کون ایسا جوہری ہے جو اس لکڑی کے جھنجھنے کی قیمت کا اندازہ کر  
سکے۔ بڑے آدمیوں کی قربانیوں پر، واہ واہ کرنے والو، لے جاؤ اس لکڑی  
کے جھنجھنے کو، اور انسانیت کے اس معبد میں رکھ دو۔ جو آج سے ہزاروں  
سال بعد میری روح تمہارے لئے تعمیر کرے گی۔



آخر کلکتہ آگیا، بھوک کی ویران بستی، سنگدل بے رحم شہر کہیں کوئی ٹھیکانہ نہیں کہیں روٹی کا لقمہ تک نہیں، سیالیدہ اسٹیشن، شام بازار، بڑا بازار، ہر شہر روتی، ذکر یا اسٹریٹ، بود بازار، سونا گاجی، نیو مارکیٹ، بھوانی پور کہیں چاول کا ایک دانہ نہیں کہیں وہ نگاہ نہیں جو انسان کو انسان سمجھتی ہے۔  
 ہوٹلوں کی باہر بھوکے مرے پڑے ہیں۔ جھوٹی پٹلوں میں کتے اور انسان ایک جگہ کھانا سٹول رہے ہیں۔ کتے اور آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک موٹر فرآٹے سے گزر جاتی ہے۔

ننگے بدن میں اسپلیاں آہنی زنجیریں معایم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر روح کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ اسے اڑ جانے دو۔ اس مہیب زنداں خانے کا دروازہ کھول دو۔ ایک موٹر فرآٹے سے گزر جاتی ہے۔

لیکن جسم روح کی فریاد نہیں سنتا۔ مائیں مرد ہی ہیں۔ بچے بھی یک مانگ رہے ہیں۔ بیوی مرد ہی ہے۔ خاوند رکشا والے عتاب کی خوشامد کرتا ہے۔ یہ نوجوان عورت مادر زاد منگی ہے۔ اسے یہ تپہ نہیں وہ جڑا ہے۔ وہ عورت ہے۔ وہ صرف یہ جانتی ہے کہ وہ بھوک کی ہے۔ اور یہ کلکتہ ہے۔  
 بھوک نے حسن کو بھی ختم کر دیا ہے۔

\*\*\*

میں اس قونصل خانے کی سیڑھیوں پر رہا ہوں۔ بے ہوش پڑا ہوں۔  
 چند لوگ آتے ہیں۔ میرے سر ہانے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔



گو یا مجھے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھ رہے ہیں۔ پھر میرے کانوں میں ایک مدھم سی آواز آتی ہے۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہے۔

"حرامی ہندو ہو گا۔ جانے دو۔ آگے بڑھو۔"

وہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اندھیرا بڑھ جاتا ہے۔

پھر چند لوگ رکتے ہیں۔ کوئی مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ "تم کون ہو؟"

میں بمشکل اپنے سجھاری پوٹے اٹھا کر آنکھیں کھول کر جواب دیتا ہوں۔

"میں ایک آدمی ہوں۔ بھوکا ہوں۔"

وہ کہتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

"سالا کوئی مسلمان معلوم ہوتا ہے۔"

بھوک نے مذہب کو بھی ختم کر دیا ہے۔

اب چاروں طرف اندھیرا ہے۔ مکمل تاریکی، روشنی کی ایک

کرن بھی نہیں، خاموشی، گہرا سناٹا۔

یہ ایک کلیساؤں میں ————— مندروں میں ————— عبادت

خانوں میں خوشی کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ ساری کائنات شیریں آوازوں سے

معمور ہو جاتی ہے۔

ایک اخبار فروش چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔

"ظہران میں بنی نوع انسان کے تین بڑے رہنماؤں کا اعلان،

ایک نئی دنیا کی تعمیر۔"

ایک نئی دنیا کی تعمیر۔!!



میری آنکھیں حیرت اور مسرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ احساسات  
پتھر کی طرح جامد ہو جاتے ہیں۔

\*\*\*

میری آنکھیں اس وقت سے کھلی کی کھلی ہیں۔

میں سیاستدان نہیں ہوں۔ سنار بچانے والا ہوں۔ حاکم نہیں  
ہوں۔ حکم بجالانے والا ہوں۔ لیکن شاید ایک نادار مغنی کو بھی یہ پوچھنے کا حق  
ہے کہ اس نئی دنیا کی تعمیر میں کیا ان کروڑوں بھوکے ننگے آدمیوں کا بھی ہاتھ  
ہوگا۔ جو اس دنیا میں بستے ہیں۔؟ میں یہ سوال اس لئے پوچھتا ہوں کہ میں بھی  
ان میں بڑے رہنماؤں کی نئی دنیا میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی فسطائیت  
جنگ اور ظلم سے نفرت ہے۔ اور گو میں سیاستدان نہیں ہوں۔  
لیکن مغنی ہو کر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اُداس نغمے سے اُداسی ہی پیدا ہوتی  
ہے۔ جو نغمہ خود اُداس ہے۔ وہ دوسروں کو بھی اُداس کر دیتا ہے۔ جو آدمی خود  
غلام ہے۔ وہ دوسروں کو بھی غلام بنا دیتا ہے۔

دنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ باقی پانچ  
آدمی کرب کی اس زنجیر کو محسوس نہ کرتے ہوں۔ جو ان کی روحوں کو چیر کر نکل  
رہی ہے۔ اور ایک ہندوستانی کو دوسرے ہندوستانی سے ملا دیتی ہے۔ جب  
تک میری ستار کا ایک تار بھی بے آہنگ ہوتا ہے اس وقت تک سارا نغمہ  
بے آہنگ و بے ربط رہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں۔ یہی حال انسانی سماج کا بھی



ہے۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی بھوکا ہے۔ یہ دنیا بھوکے رہے گی۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی غلام ہے۔ سب غلام رہیں گے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی مفلس ہے۔ سب مفلس رہیں گے۔

اسی لئے میں تم سے یہ سوال پوچھ رہا ہوں۔

تم مجھے مُردہ نہ سمجھو۔۔۔۔۔ مُردہ تم ہو۔۔۔۔۔ میں زندہ ہوں۔ اور اپنی پھٹی پھٹی بے نور، بے لہجہ آنکھوں سے ہمیشہ تم سے یہی سوال کیا کر دوں گا۔ تمہاری راتوں کی نیند حرام کر دوں گا۔ تمہارا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، چلنا، پھرنا سب دو بھر ہو جائے گا۔۔۔۔۔ تمہیں میرے سوال کا جواب دینا ہوگا۔۔۔۔۔ میں اس وقت تک نہیں مر سکتا۔ جب تک تم میرے سوال کا تسلی بخش جواب نہ دو گے۔

میں یہ سوال اس لئے بھی پوچھ رہا ہوں کیونکہ میں نے جیل پر ہی کو بے گورد کفن سرک پر چھوڑ دیا ہے۔ اور میرے ہاتھ میں لکڑی کا ایک جھنجھٹا ہے۔



# موبی

موبی ادہی اوکارہنے والا تھا۔ اور فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے نیویارک میں وکالت کرتا تھا۔ موبی کے بال گھنے اور گہرے سنہری تھے۔ اور میہی سونا اس کے رخساروں پر تھا۔ ایسا سونا جو ماہِ ستمبر میں سیب کی جلد پر رخشاں نظر آتا ہے۔ موبی کا قد چھوٹے سے کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اس کا ہنسنے بے جھجک اور بچپن کی طرح معصوم تھا۔ دو نتھنوں کے درمیان ناک کی نوک پر ایک چھوٹا سا نل تھا۔ اس چھوٹے سے سیاہ نقطے نے موبی کے چہرے کو شباب کی تمام تر شوخیوں کے باوجود بھولا اور معصوم سا بنا دیا تھا۔ اور وہ اس بچے کی طرح دکھائی دیتا جس نے اپنی ناک کو فلم کی نوک سے گنڈا کر لیا ہو۔ اسی لئے تو پردیزا سے "علینا موبی" کہا کرتا تھا۔ اس پر موبی اور پردیزا میں اچھی خاصی چغ رہتی تھی۔ جو اکثر شریفانہ ہاتھ پائی تک بڑھ جاتی تھی۔

پردیزا اور شام کی ملاقات موبی سے ان کے سٹوڈیو میں ہوئی تھی موبی آسام اور بنگال سے لوٹ کر یہاں چند ماہ کے لئے آیا تھا شروع دسمبر کے دنوں میں وہ اکثر چھاؤنی کی سڑکوں پر اکیلا گھومتا ہوا نظر آتا۔ لیکن اب اسے چھاؤنی کی سڑکوں پر ساکھل



کی سواری کرنے، سیٹی بجانے اور اکیلے گھومنے سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ چھاؤنی کے طبقہ اثبات کے کاروبار کی افراد بھی اسے پسند نہ آتے تھے۔ اور سینما میں بھی بالعموم ہالی وڈ کی بھی وہی تصویریں دکھائی جاتیں جن میں ننگی ٹانگوں کی نمائش زیادہ ہوتی۔ کیا سینما کے مستم فوجیوں کو اس قدر کور ذوق سمجھتے ہیں کہ عورتوں کے گرم گوشت کے علاوہ انہیں اور کسی چیز کی طلب نہیں۔ یہ سوچ کر اسے اکثر اس قدر غصہ آتا تھا کہ وہ ہفتوں کسی سینما گھر کے قریب نہ چھٹکتا۔

یہ بات نہ تھی کہ اسے سینما سے نفرت تھی بلکہ وہ تو ہالی وڈ کی ان مخصوص تصویروں کو دیکھنا چاہتا تھا جو سماجی طنز کی حامل ہوتیں بلکہ ایسی تصویریں یہاں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ ورنہ ہر بار وہی ننگی ٹانگیں بٹھرتے ہوئے کولے کھلی ہوئی بتیسی، پستانوں کے کبوتر مائل پرداز اور جڑ بگ کا ناچ۔ یا اللہ اس جڑ بگ سے کب خلاصی ہوگی؟

اسی لئے تو وہ اکثر سائیکل لئے سڑکوں پر اکیلا چکر کاٹتا نظر آتا تھا۔ اسٹوڈیو کے سامنے سے وہ کسی بار گزر چکا تھا بلکہ اسٹوڈیو کے اندر جانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اس نے اس خواہش کو ہر بار اپنے دل میں دبا دیا تھا۔ پھر بھی یہ خواہش بار بار ابھرتی تھی۔

قرجینی گبری ہو۔ خواہش اسی قدر بے چین ہوتی ہے — نہ جانے گور میں مردوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ کرمس کے دن تو خود موتی کی حالت مردوں سے بھی بدتر تھی۔

استفدہ پریشان، آوارہ، کھویا کھویا سادہ محسوس کر رہا تھا۔ دوبارہ







بناتے تھے۔ وہ نیزی سے سائیکل گھما کر سٹوڈیو کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے پر اسے رکنا پڑا کیونکہ بھان چوکیدار راہ روکے کھڑا تھا۔ چوکیدار نے اسے اسٹوڈیو کا اجازت نامہ دکھائے بغیر اندر جانے سے روک دیا۔ موبی کے پاس اجازت نامہ کہاں سے آنا؟ لیکن ہندوستانی چوکیدار کی یہ ہمت۔ اس نے سائیکل آگے بڑھا کر کہا۔

مجھے جانے دو۔ میں اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے لہجے میں حکم تھا۔ نفخ اور غرور لیکن چوکیدار پھر بھی مرعوب نہ ہوا اور بات بڑھ گئی۔ راہ گیر اکٹھے ہو گئے۔ پرویز پورچ میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ جب اس نے ایک امریکی فوجی کو لوگوں میں گھرے دیکھا تو وہاں سے آہستہ آہستہ اسٹوڈیو کے دروازے تک گیا کہ دیکھے کیا تماشا ہے؟

"کیا بات ہے لالہ۔؟" اس نے چوکیدار سے پوچھا۔  
 چوکیدار جس کا چہرہ اس وقت ایک قندھار میاں کی طرح سرخ نظر آ رہا تھا۔ بلند آواز میں بولا۔  
 "صاحب اندر آتا ہے۔ ام بونٹا ہے۔ تمہارا کاغذ کھرا ہے۔ صاب کے پاس کاغذ نہیں آئے تو ام کیسے جانے دیگا۔؟"  
 موبی نے پرویز سے کہا۔

"یہ چوکیدار بڑا بدتمیز ہے۔"

پرویز نے کہا۔ "آزاد ملک کا رہنے والا ہے نا۔ ابھی غلامی نہیں سیکھی۔"  
 پرویز نے بھان کو اجازت نامہ لکھ کر دیا۔ اور موبی کو اندر آنے کو کہا۔



ٹپھان پرچہ لے کر بڑبڑایا۔

”اوخوہم قندھاری ٹپھان ہے۔ ام کسی سے نہیں ڈرتا اے ام کابل سے آیا اے۔ خوام اپنے ملک میں صاب نوک تو کیا صاب نوک کی ریل گاڑی کو بھی گھسنے نہیں دیتا اے۔ اوخو ریل گاڑی آئے گا تو صاب نوک بھی آئے گا۔ خوہم ہندوستانی نوک بڑا بے وقوف ہوتا ہے۔“

”کیا کہہ رہا ہے یہ خبیث۔“ موبی نے پوچھا

پر دیر نے بنایا تو وہ سننے لگا۔ بولا۔

”اچھا ہوا میں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ ورنہ میں اسے ایک چانٹا ضرور لگا دیتا۔ گو مجھ سے کہا گیا ہے کہ کبھی کسی صورت میں..... کسی ہندوستانی کو چانٹا نہ مارا جائے۔“

پر دیر نے کہا۔

”ہاں اچھا ہوا۔ کیونکہ وہ ہندوستانی نہیں۔ افغان ہے۔“

”افغان۔“ موبی نے معصومیت سے پوچھا۔ ”دونوں میں کیا فرق ہے۔“

پر دیر نے کہا۔ ”وہ ہندوستانی، موتا تو چانٹا کھانے کے بعد دن بھر

مٹھاری جوتیاں سیدھی کرتا اور شام کو مٹھیں سلام کر کے تم سے بخشیش کا طالب ہوتا۔

مگر یہ چوکیدار تو افغانی ہے۔ اور افغانی اور ہندوستانی میں یہی فرق ہے کہ افغان

کے پاس چھری ہوتی ہے۔ اور ہندوستانی کے پاس سلام۔“

موبی مسکرایا۔

”میں تم سے سیاست پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا۔..... مگر



یہ تو نیا و تم نے اپنے اسٹوڈیو کی حفاظت کے لئے ایک افغانی کو کیوں مقرر کر رکھا ہے۔“  
 پرویز نے کہا۔ ”ہماری قوم کا دستور یہی ہے۔ ہم اپنے ملک کی حفاظت  
 کے لئے انگریزوں کو رکھتے ہیں۔ اور اپنے اسٹوڈیو کے لئے افغانیوں کو۔“  
 ”تو کیا تم اپنے اسٹوڈیو کی خود حفاظت نہیں کر سکتے۔؟“  
 پرویز نے تلخی سے کہا۔

”اگر ایسا کر سکتے تو تمہیں سمندر پار سے یہاں آنے کی دعوت دیتے۔؟“  
 موبی نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”بیر امریکی سپاہی ہوں۔۔۔۔۔  
 میرا نام موبی ہے۔۔۔۔۔ میں تمہارا اسٹوڈیو دیکھنا چاہتا ہوں۔“  
 پرویز نے فخر کرتے ہوئے کہا۔ ”مزاج کیسا ہے۔ میرا نام پرویز ہے۔ رہا  
 اسٹوڈیو تو آج تعطیل ہے۔ اسٹوڈیو کے مالک یہاں نہیں ہیں اور پھر آج نوکرس  
 ہے۔ تم اسٹوڈیو کیوں دیکھنا چاہتے ہو۔ آج نوکسی ناچ گھر میں کسی نازک کریا۔۔۔۔۔!“  
 موبی نے سنجیدہ رویہ کر کہا۔  
 ”مجھے ناچ پسند نہیں۔!“

پرویز نے اسے حیران نگاہوں سے دیکھا۔ پھر کہنے لگا۔ ”آؤ تمہیں اپنے  
 دوستوں سے ملاؤں۔“

برآمدے میں بہت سے لوگ بید کی کرسیوں پر بیٹھے برج کھیل رہے تھے۔  
 پرویز نے غبار و غصہ کر دیا۔ یہ متنازع ہیں۔ یہ عذرا بہن۔ یہ حمید۔ یہ پرکاش۔ یہ شام۔۔۔۔۔  
 ہم لوگ اس وقت اسٹوڈیو کی فارگو کے اندر نظر میں بیٹھے ہیں۔ تصویر دیکھنے۔  
 جا رہے ہیں۔“



”کونسی تصویر۔؟“

”کوئی سی بھی۔۔۔۔۔ ہندوستانی تصویر دیکھیں گے۔ تم بھی چلو گے نا۔ فردر!“

موبی قدرے توقف کے بعد بولا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے آج تک

کوئی بھی ہندوستانی تصویر نہیں دیکھی۔ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”تو چلو۔!“

فارگو آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر چلے گئے۔ سینما مینچے تو ٹکٹ لے کر اندر بیٹھے۔

اور مونگ پھلی۔ تلے ہوئے آلو۔ وال۔ چوڑا۔ اور کباب کھانے لگے۔ کباب کھا چکے تو

پان آگئے۔ موبی ہر بار انہی جیب سے پیسے نکالتا۔ لیکن وہ لوگ اسے مال دیتے۔ ”گھبراؤ

نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ امریکی سپاہی بہت امیر ہوتے ہیں۔ ہم بھی کسی روز تمہاری

کھال اتار لیں گے۔ مگر آج نہیں۔ آج تو کرسمس ہے۔!“

تصویر دیکھی گئی۔ سب نے موبی سے پوچھا۔ موبی نے بھی مردت میں تعریف

کر دی۔ ”اچھی تھنی۔ مگر گانے بہت زیادہ تھے۔ غالباً میوزیکل ہوگی۔!“

اس نے پوچھا۔

”یہاں ہر ٹکچر میوزیکل ہوتی ہے۔ مشٹر۔“ سمجھے مشٹر موبی۔؟“

اس نے سگریٹ کا کسٹن زبردور سے کھینچتے ہوئے موبی کو گھورا۔

”مشٹر کیوں نہیں۔؟ مشٹر کیوں۔؟“

موبی نے پوچھا۔

”بس میں تو اسے اسی طرح کہتا ہوں جس سے مجھے محبت ہو جاتی ہے۔

سمجھے بیٹو تھی کے۔!“



"بھوسنی کیا... کیا مطلب۔" موبی نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب و مطلب ہم نہیں جانتے، بس یہ پیار کی باتیں ہیں۔"

سمجھے۔ موبی دو بی چوچی مچی۔ "شام نے موبی کے سنہری بالوں کو ہلادیا۔

موبی نے خوش ہو کر کہا۔ "اچھا اب میں تمہیں شام کی بجائے شیشی کہا کروں گا۔"

"شیم۔ شیم۔" حمید نے کہا۔

"پھٹے منہ۔!" شام کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"فٹے مو۔" کیا۔

حمید نے کہا۔ "یہ بھی ایک گالی ہے۔ یہ سالا پنجاڑا ہے۔ اور گالی کے

سوا اور کچھ نہیں آتا! سے، خوشی ٹیک خوشی نہ ٹیک۔"

"ہاں ٹھیک کہتا ہے یہ پود بیا۔!" شام نے موبی کے شانے پر ہاتھ مار کر

کہا۔ "مگر کہو تو آج تمہیں کسی چینی رستوران میں لے جا کر کرسمس کا جشن منوادیں۔

جلدی بولو۔!"

"فٹے مو۔!" موبی نے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالی کر کہا۔ "بس آج سے اپنے

کرنے کو یہی کہا کروں گا۔ ادبوائے۔ ادبوائے۔۔۔۔۔!!"



فنگ کنگ رستوران میں برقی قندیلوں کے فانوس کے نیچے کھانے کی میز

تھی۔ اور سامنے دیوار پر جیانگ کافی شک، چرچل اور روز ویلٹ کی تصاویر تھیں۔







کی جھلک نظر آتی تھی۔ کیا یہ نظر کا دھوکا تھا؟ یا اس کے ذہن کی عصبیت۔ !  
 شام بھی خاموش تھا۔ پوری مجلس پر خاموشی طاری تھی۔ نامعلوم کیوں؟  
 موبی نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس رستوران کے نئے ہوئے پران بہت پسند ہیں تمہیں پسند ہیں شنبی؟“  
 شام چونک پڑا۔ ”بہت“ اس نے آہستہ سے کہا۔ اور ایک پران اٹھا کر اپنے  
 منہ میں ڈال لیا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لیکن ان کی میز کے علاوہ اور کسی  
 میز پر ہندوستانی موجود نہ تھے۔ یہاں اپنے ہم وطن بہت کم ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر  
 یکایک اسے خیال آیا۔ ہندوستانی یہاں کہاں؟ وہ تو بنگال میں۔ اڑیسہ میں۔  
 آندھرا میں۔ مدراس میں۔ بہار میں بھوکا مر رہا ہے۔ جاہل۔ اس کا  
 حلق رکنے لگا۔ !

پرکاش نے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
 ”چینی چاپ سوئی میں وہ لطافت نہیں ہوتی جو امریکی چاپ سوئی میں  
 ہوتی ہے۔ !“

حمید نے کہا۔ ”ہاں۔۔۔ اور غذا ایٹ بھی کم ہوتی ہے۔ !“  
 ممتاز نے کہا۔ ”مجھے بھی امریکی چاپ سوئی بہت پسند ہے۔“  
 ”شکریہ۔“ موبی نے خوش ہو کر کہا۔

”میں اسے اپنی کرسمس کا بہترین ٹوسٹ سمجھوں گا۔“  
 دو کینڈین ہوا باز قریب سے گزرتے گزرتے رک گئے۔ موبی نے نگاہ اٹھا  
 کر ان کی طرف دیکھا اور جھٹ اٹھ کر ان کی طرف بڑھا۔



"یہ جان ہے، یہ نام ہے۔ یہ دونوں مونٹریال سے آئے ہیں۔" موبی نے اپنے  
 ہندوستانی دوستوں سے ان کا تعارف کرایا۔ رسمی تعارف کے بعد وہ دونوں بھی  
 اسی میز پر بیٹھ گئے۔ "مگر ہم کچھ کھائیں گے نہیں۔" نام نے کہا۔ "ہم نے ابھی کھئی۔"  
 پھر چند لمحے خاموشی رہی۔ چینی سازوں کا مدھم مدھم سریلانغہ ریکارڈ سے  
 نکل رہا تھا۔

موبی نے کہا۔۔۔۔۔ "جان۔۔۔۔۔ یہ کرس۔۔۔۔۔ وطن سے کتنی دور  
 آئی ہے۔" جان خاموش رہا۔

نام نے کہا۔ "عنوبروں پر برف دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔۔  
 باہر نظر دوڑاتا ہوں تو آسمان پر پھیکے پھیکے تارے نظر آتے ہیں۔"  
 جان نے کہا۔ "بیرا ایک گلاس پانی کالاؤ۔"

موبی نے کہا۔ "تمہارے چھوٹی چھوٹے بہن بھائی تمہارے ماں باپ  
 کا دل بہلانے کو موجود ہوں گے۔ لیکن میری ماں کے پاس والد کے مرجانے کے بعد میرے  
 سوا اور کون ہے۔۔۔۔۔؟ شروع ہی سے جان ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت  
 قریب رہے ہیں۔ کبھی کبھی ماں کی یاد تو مجھے بزدل بنا دیتی ہے۔"

نام نے کہا۔ "اس وقت گھر میں مومی شمعیں ہوں گی۔۔۔۔۔ کرس  
 کا پٹیرا اور باہر گلی میں اکارڈین کا نغمہ۔ ہائے بس ایک دفعہ اسے سننے کو جی چاہتا ہے۔  
 موبی نے کہا۔

"میں تو ان دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے آج کے دن۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔" وہ چپ ہو گیا۔



جان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا: "پر دیز صاحب آپ کیا تنخواہ لیتے ہیں؟"  
پر دیز نے جواب دیا: "آٹھ سو۔"

"بس۔" جان پر دیز کا جواب شکر بہت حیران ہوا۔ "ہمارے ہاں تو اتنی  
تنخواہ ایک کان کن لیتا ہے۔ آٹھ سو روپے۔"

حمید نے کہا: "یہاں یہ تنخواہ بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان کی آمدنی فی  
کس چھ پیسے یومیہ ہے۔"

"ہاں، یہ بے حد غریب ملک ہے۔" موٹریاں کے ہوا باز جان نے لاپرواہی  
سے کہا: "موبی، واپس کیمپ چلو گے۔"

"ابھی نہیں۔" نم جاؤ، میں ذرا ٹھہر کر۔"

دونوں کنیڈین ہوا باز، گڈ نائٹ کہہ کر رخصت ہوئے۔ اس کے بعد موبی  
بل ادا کرنے پر تری دیوینک مقرر رہا۔ آخر جب شام نے اسے گائی دی۔ تب جا کر وہ چپ  
ہوا۔ بل ادا کر کے رستوران سے باہر نکلے تو پر دیز، پرکاش، حمید، عذرا بہن اور  
ممتاز نے بھی رخصت چاہی۔

سولانگ۔!

سولانگ۔!

شام اور موبی اکیلے رہ گئے۔ وہ دونوں اب اس سڑک پر سے گزر رہے  
تھے۔ جہاں انگریزی سینما گھروں کی عمارتیں تھیں۔ ہوا میں شراب تھی۔ کپڑوں میں غطر  
تھا۔ لبوں پر مغربی نغمے۔ نوشیرواں اینڈ نوشیرواں اینڈ سنز شراب فروش کی دوکان کے  
وسیع احاطے میں ایک لاؤڈ اسپیکر لگا ہوا تھا۔ اور ایک فوجی اپنے ساتھیوں کو میسج پر



ایمان لانے کی تلقین کر رہا تھا۔

”ہم گناہگار ہیں۔ ہم سب گناہگار ہیں۔ آؤ مسیح کے قدموں میں جھک جاؤ۔“  
سننے والوں میں امریکن، کینیڈین، آسٹریلین اور انگریزی سپاہی تھے۔ جو  
چوراہے میں سے گزرتے گزرتے رک جاتے تھے۔ اور چند منٹ رک کر پھر چلے جاتے تھے۔  
تین چار ہندوستانی بیرے بڑے غور سے اس لیکچر کو سن رہے تھے۔ اور پھر مدرا سی  
زبان میں اس پر تنقید بھی کرتے جاتے تھے۔ ایک گداگر، ایک کوڑھی اور ایک خد متگار  
جس کے پاس دو جٹادری قسم کے کتے زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ بڑے غور سے  
سن رہے تھے۔

”مسیح کے قدموں میں جھک جاؤ۔ ہم سب مسیح کی بھڑیا ہیں۔“

”بھڑیا۔! یا بھڑیے۔!“ شام نے پوچھا۔

موبی نے کہا۔

”غالباً تنہا اشارہ جنگ کی طرف ہے مجھے جنگ کی شقادت سے  
انکار نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انسانی ترقی کے لئے آدرش کے لئے خون بہانا  
جائزہ ہے۔!“

”کس کا آدرش۔!“ شام نے پوچھا۔

”ایک آدرش امیر کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش غریب کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش  
سفید آدمی کا ہوتا ہے۔ ایک آدرش کالے آدمی کا ہوتا ہے۔ دونوں انسانی ترقی کے لئے  
سوچتے ہیں لیکن الگ الگ۔۔۔۔۔ ان دونوں کے پسے جدا جدا ہیں۔ مجھے تو  
ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جنگ نہیں۔ دو سپینوں کی لڑائی ہے۔!“



”تم سچ کہتے ہو۔“ مولیٰ نے جواب دیا۔

”لیکن یہ کالے اور گورے آدمیوں کے سپنوں کی لڑائی نہیں۔ ہم تو اس

سپنے کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ جو فسطائیت کے اجارہ دار دیکھ رہے ہیں۔ وہ سپنا جو  
تو جو دیکھتا ہے۔ جو ہٹلر دیکھتا ہے۔ ایک کالا ہے۔ ایک گورا۔ تمہاری دلیل غلط ہے۔

میں جانتا ہوں یہ سپنے بہت بھیانگ ہیں۔ مجھے اس سے نفرت بھی ہے لیکن

اس کا ثبوت کہ تم بھی وہی سپنا نہیں دیکھ رہے ہو۔“

”اس کی گواہ ہماری امریکی تاریخ ہے۔“ مولیٰ نے فخریہ لہجہ میں کہا۔

”انگریزوں کی جمہوریت پسندی ہے۔ روس کا اشتراکی نظام ہے۔ چین کی

کومنٹانگ ہے۔ جسے سن یات سین ایسے آزادی پسند نے ترتیب دیا ہے۔ ہمارا ضمیر

بالکل صاف ہے۔“

”اور ہندوستان۔“ شام نے چڑ کر کہا۔

”غالباً تمہارا ضمیر بھی جنگی مصلحتوں کے پیش نظر آہن اور کنکریٹ کا بنا ہوا

ہے کہ اس پر کسی اخلاقی ہم کا اثر نہیں ہوتا۔“

مولیٰ نے کہا۔ ”میں اس ملک میں تمہارا مہمان ہوں۔ تمہاری حکومت کا

مہمان ہوں۔ مجھے اس ملک کے حالات کے بارے میں زیادہ آگاہی نہیں ہے۔ اور پھر

میں یہاں کی پیچیدہ سیاست کی گتھیوں کو سلجھا بھی نہیں سکتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ

جب میں پچھلے دنوں بنگال میں تھا اور ہزاروں آدمیوں کو قحط سے مرتے دیکھ رہا تھا۔

تو بس یہی سوچ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ کیسے لوگ ہیں۔ اپنے سامنے اپنے ہمسایوں کو اپنے

عزیزوں کو مرنے دیکھتے ہیں۔ اور انکی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ان کے لئے ان کے ہاتھ میں چاول کا



ایک دانہ نہیں، آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہیں۔ سچ کہتا ہوں۔ میں نے ایسے پتھر دل  
لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ کیا یہ قومیت کا فقدان تو نہیں؟  
”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے شیمی! جیسے یہ ایک ملک نہیں کہی ملک ہیں۔ ایک  
قوم نہیں کہی قومیں ہیں۔ ایک زبان نہیں کہی زبانیں ہیں۔ ایک کلچر نہیں کہی کلچر ہیں۔  
ہر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ اور اپنی جگہ منفرد!“

شام نے پوچھا: ”تمہارا کیا خیال ہے؟ بنگال کی مدد کس نے کی؟ کیا یہ  
چند لاکھ روپے، اناج کی چند بوریاں جو سرکاری یا غیر سرکاری طور پر پبلک کے ایما پر  
یا حکومت کے نام پر بنگال میں صرف کی گئیں، بنگال کی بھوک کو مٹا دینے کے لئے کافی  
تھیں؟ یہ مدد تو آٹے میں نمک کے برابر تھی بنگال کو خود بنگال نے بچایا ہے۔ ورنہ آج  
نہیں ایک بنگالی بھی زندہ نظر نہ آتا۔ فحط کی شدت کا وہ عالم تھا۔  
امداد کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ جو آدمی خود موت کے جھنور میں پھنسا  
ہو وہ دوسروں کی مدد کیا کریگا؟ تمہارے گھروں میں خوشحالی ہے۔ فارغ البالی ہے۔  
اجناس کی کثرت سے تم لوگ ترس کھا کر اپنے ہمسایوں کی مدد کر سکتے ہو۔ ان کی مصیبت  
پر آنسو بھی بہا سکتے ہو۔ لیکن جس غریب کے پاس خود کھانے کو کچھ نہ ہو۔ وہ اپنے  
ہمسائے کی کیسے مدد کریگا۔

اور آنسو۔ اس منزل پر پہنچ کر آنسو بھی جواب دے جاتے ہیں۔  
آخر آنسو بھی نور روٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب روٹی ہی نہ ملے تو آدمی کیسا  
دوسروں کی فاقہ مستی پر آنسو بہائے گا۔؟

ہم ایک قوم نہ تھے، بہت سی قومیں تھیں۔ لیکن یورپ میں



بھی تو بہت سی قومیں ہیں NRRA ان کی مدد کے لئے تیار ہے۔ ہمارے لئے کیوں نہیں بلقانی قومیں اور خصوصاً یونان قحط کی کس منزل سے گزر رہا ہے۔ وہاں، اتحادیوں نے کس مشکل سے گندم کی بوریاں پہنچائی ہیں۔ اور یہاں ہم مانگتے ہیں۔ گندم کی بوریاں اور ملتی ہیں دہکی کی بوتلیں۔“

سولی نے ہنس کر کہا۔

”بس میں اپنے کانوں سے سن رہا ہوں۔“

”کیا مطلب۔؟“

”سب سن رہا ہوں۔ دماغ میں جگہ دے رہا ہوں لیکن کچھ کہہ نہ سکتا ہوں۔“

”کیوں۔؟“

”ہمیں ہدایات ہیں۔ سب کچھ سن لو۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولو۔ خاص طور پر اس مسئلے پر۔۔۔۔۔ سنو، مجھے ایک اور دلچسپ بات اس وقت یاد آئی، مجھ سے کہا گیا ہے کہ ہندوستانیوں سے تحفے بخائف نہ قبول کرو۔ اور اگر قبول کرو تو ایسے بخائف جو بہت ہی کم قیمت کے ہوں۔“

”کیوں۔؟“

۔۔۔۔۔؟

”اس لئے کہ میں نے سنا ہے کہ ہندوستانیوں کا یہ دستور ہے کہ ایک حقیر سا تحفہ دیکر بہت بڑا انعام حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں۔“

شام کی تلخی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

یہ سچ ہے۔! مگر۔۔۔۔۔ کاش یہ ہدایات آج سے دوڑھ سو سال پہلے



ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو دی جاتیں۔ ہم تو اپنے تحفوں میں اپنا گھر بھی لٹا بیٹھے اس سے ہمیں جو فائدہ پہنچا۔ وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہندوستان میں ہمیشہ لوٹنے والے آتے رہے۔ ہندوستانیوں نے کبھی باہر جا کر کسی ملک یا قوم کو نہیں لوٹا ہے۔۔۔۔۔ اور آج ہم پر یہ تہمت لگائی جاتی ہے۔ اس تہذیب کے وارثین کی طرف سے جنہوں نے ریڈانڈین لوگوں سے ان کا سارا ملک ہتھیالیا تھا۔؟ خدا جانے اس وقت یہ ہدایات کیوں نہ دی گئیں۔

موبی نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو۔؟"

"وہ سب کچھ جو تم غلام یوروپ کے لئے بخویر کرتے ہو، آزادی اور

روٹی بلکہ ہمارے لئے صرف آزادی۔ پھر روٹی ہم خود پیدا کر لیں گے۔"

موبی نے کہا۔

"آزادی دی نہیں جاتی، حاصل کی جاتی ہے۔"

"تو غلام یوروپ کو بھی کیوں نہ اس کی قسمت پر چھوڑ دو۔ اسے خود اپنے درد

کا مدا د کرنے دو۔"

"یہ تمہارا اپنا اندرونی مسئلہ ہے۔ ہم اس میں کیسے دخل دے سکتے ہیں۔"

"یہی سلوک یوروپی قوموں کے ساتھ روا رکھو۔ تب تمہاری لفظی حیثیت

مستحکم ہوگی لیکن اخلاقی اعتبار سے وہ بھی بے حد ناقص ہوگی۔ کیونکہ انسانی سماج ایک

جسم ہے۔ اگر مانگ پر زخم آجائے تو دماغ مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ شاید ابھی تم

اس حقیقت کو نہیں سمجھتے ہو: آٹھ دس جنگوں کے بعد سمجھو گے کہ امن اور جنگ کی طرح



انسانی آزادی بھی ناقابل تقسیم ہے۔ وہ کل بنی نوع آدم کی میراث ہے۔ جب تک وہ سارے انسانوں میں مشترک نہیں ہوتی۔ ہم تو خیر غلام رہیں گے ہی لیکن تم بھی ہر پچیسویں سال اپنی نوجوان نسل کو موت کے گھاٹ اتارتے رہو گے۔ ہر پچیسویں سال اپنی نوجوان دلہنوں کو رانڈ اور اپنے بچوں کو ینیم کرتے رہو گے۔ تمہارے سیاستداں غالباً اسے دانشوری سے تعبیر کرتے ہوں گے۔ میں تو اسے خودکشی کہوں گا۔

"نام سچ کہتا تھا۔" موبی نے سنسن کر کہا۔

"کسی پڑھے لکھے ہندوستانی سے بات مت کرو۔ وہ ہر چہرہ کی سیاست پر آجائے گا۔"

شام کا لہجہ پکا پک نرم پڑ گیا۔ اس نے شرمندہ سا ہو کر موبی سے کہا۔

"اچھا تو بتاؤ۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ کیا باتیں کریں۔"

"فٹے مو۔" موبی چلایا۔

شام اور موبی سنسنے لگے اور وہ دفعتی مغایرت دور ہو گئی۔

شام نے موبی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھا۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ روئے دلدار کی باتیں کریں۔۔۔۔۔"

پہلے میں اپنے محبوب کا سراپا بیان کرتا ہوں۔۔۔۔۔ پھر عین موقوفہ دنگا۔۔۔۔۔

سنو۔۔۔۔۔ اس کا نام ہے مو۔۔۔۔۔"

شام کی آنکھیں خوابیدہ سی ہو گئیں۔ وہ اپنے محبوب کا نام بھی پوری طرح ادا نہ کر سکا کہ وہ نام خضا میں شہر و شکر کی طرح گھل گیا۔ محبوب کا نام لیتے کہ اس کے لہجہ میں ایسی حلاوت آگئی کہ موبی نے اس نام واک مدغم، پیٹھے سانس







پالنے کا ارادہ ہے۔ یہ تو جو جنسو کے نشان ہیں۔

”آج کل جو جنسو سیکھ رہے ہو۔“ پروین نے پوچھا۔  
 ”نہیں۔ سکھا رہا ہوں۔ عرصہ ہوا میں نے اسے جاپان میں سیکھا تھا۔“  
 ”جو جنسو اور باکنگ ان دونوں میں تم کس کو بہتر سمجھتے ہو۔“  
 پروین نے پوچھا۔

”باکنگ میں روانگی ہے، جو جنسو میں چالاکی۔ باکنگ میں دیانت  
 ہے جو جنسو میں ریاکاری، باکنگ میں مقابلہ سیدھا اور صاف ہوتا ہے۔ جو جنسو  
 میں موقعہ شناسی اور عیاری سے کام لیا جاتا ہے۔“ موبی نے اپنی انگلیوں پر  
 گنتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں کھیل دو مختلف اقوام کی فطرت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔“  
 پروکاش نے کہا۔

پروین نے اصرار کیا۔  
 ”پھر بھی تم ان دونوں میں سے کس کو بہتر سمجھتے ہو۔“  
 عذرا مہین نے کہا۔

”تم موبی سے پوچھ رہے ہو کہ وہ امریکہ اور جاپان میں سے کس کو پسند  
 کرتا ہے۔“ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔  
 حمید نے کہا۔

”جو جنسو میں سمجھتا ہوں سارا اڑنگے کا کھیل ہے۔“ اڑنگے پر لاتے ہی  
 کھلاڑی مخالف کو دے پٹختا ہے۔ دراصل اس دنیا میں اڑنگا بری چیز ہے شاید



کسی یونانی فلسفی کا قول ہے کہ اگر اس کرہ ارض کو کہیں پر ٹھیک طرح سے اڑنگے پر لایا جائے تو یہ زمین یوں چٹکیوں میں اپنے محور پر الٹی گھوم جائے۔  
پرکاش نے کہا۔

”جاپانی یہی کوشش کر رہے ہیں نا لیکن نہیں جانتے کہ اڑنگے پر لانے کے لئے بھی کس قدر قوت درکار ہوتی ہے۔“

موبی بولا۔ ”اور قوت باکسنگ ہی سے آتی ہے۔“ پھر وہ گفتگو کا موضوع بدل کر کہنے لگا۔

”عذرا بہن اس روز داڈیا ہال میں آپ نے بنگال کے فاد کشوں کیلئے جو ڈرامہ کیا تھا وہ ہمیں بے حد پسند آیا۔“

”تم کہاں بیٹھے تھے؟“ ممتاز نے شکایت آمیز لہجہ میں پوچھا۔

”چوتھی قطار میں۔ میرا کرنل میرے ساتھ تھا۔“

”پھٹے منہ۔“ شام چلایا۔

”فٹے مو۔“ موبی نے ہنس کر اپنا ہاتھ بلند کیا۔

”جانتے ہو شیمی میرا کرنل مجھ سے فٹے موسکر بے حد خوش ہوتا ہے۔“

غالباً اسی وجہ سے اس نے مجھے جو جنسو گروپ کا آفیسر مقرر کیا ہے۔ اور معلوم ہے تمہیں۔ اس روز تمہارا کھیل دیکھ کر اس نے مجھ سے کیا کہا؟ اس نے مجھ سے کیا۔

ادبوائے۔ ادبوائے۔... مجھے معلوم نہ تھا کہ ہندوستانی ڈرامے

بھی اس بلند پایہ حقیقت نگاری کے حامل ہو سکتے ہیں۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اب میں ہندوستانی فلمیں بھی دیکھا کر ڈنگا۔ کل ہم اسی جوش میں آکر شکستہ دیکھنے چلے گئے



خیسر۔! عذرا بہن تمہارا ناچ تمہارے ڈرامے کی جان تھا۔  
 شام نے موبی کو گھورا۔ "اور ہمارا ذکر تک نہیں کرتے ہو بھوتنی کے۔"  
 میں اس ڈرامے کا پردہ دیر سے کھتا۔!

"فٹے مو۔" موبی نے اسے چڑانے کے لئے کہا۔ شام اس کی طرف پکا۔  
 اور موبی وہاں سے بھاگا۔ شام اس کے پیچھے پیچھے، ایک سبز تلے پر وہ دونوں خوب  
 گنہم گتھا ہوئے موبی نے جو جتسو سے وار کیا۔ پھر باکسنگ سے شام نے پہلوانی کے  
 واؤ سے کام لیا۔ اور چشم زدن میں موبی نیچے گتھا۔ اور شام اس کے اوپر بھر دونوں  
 ہنس کر اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سنو موبی۔" پرکاش سمجھانے لگا۔ "یہ جو جتسو تمہارے کسی کام کی نہیں۔"  
 "پہلوانی سیکھو پیارے۔" شام نے کہا۔

"کرنل سے کہو کہ وہ اپنے سپاہیوں کو یہ کھیل سکھائے، مجھے ساتھ لے چلو۔"  
 ہندی پہلوانی کے مقابلے میں نہ باکسنگ چلتی ہے نہ جو جتسو۔!  
 "مگر تمہارے ملک کے تو کسی کام نہ آئی یہ پہلوانی۔!" موبی نے وار کیا  
 اور اس نے دیکھا تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ دوسرے لمحے میں ہر سندوستانی کا چہرہ زرد  
 تھا۔ رنگ اڑ گیا تھا۔ شام، جو ابھی ابھی اس قدر شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔  
 اب گردن جھکائے کھڑا تھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ بہت افسوس ہے۔" موبی نے پر خلیص لہجہ میں کہا۔

"میرا یہ منشا ہرگز ہرگز نہ تھا۔"  
 عذرا بہن نے سنجیدہ رو ہو کر کہا۔



"بیٹھو، اب چائے پیو، پھر ندی کے کنارے جا کر بیٹھیں گے اور پرویز  
سے گانا سنیں گے۔"

چائے پیتے پیتے موبلی نے ڈھل ڈھل کی فضا کو اپنے احساسات میں  
رہنے اور جذب ہو جانے کے لئے اپنے تخت الشعور کو ماحولی کی گرفت سے آزاد  
کرنے کی کوشش کی۔ اور جو مہی اس کوشش کے زیر اثر اس کے پرانے محسوسات  
اور جذبات کا آہنی جال اس کے شعور، تخت الشعور اور لاشعور سے الگ ہوتا  
گیا۔ اس کے جسم و جان میں ڈھل ڈھل کی فضا کا حسن سراپت کر تا گیا۔ یہ حسن نہ ہر نہ تھا۔  
یہ حسن شراب بھی نہ تھا۔ بلکہ ایک اعلیٰ ارفع مسرت بھری مہی کی طرح بے تش  
معصوم اور تقویت دینے والا جذبہ تھا۔ وہ آم کے پیر کے نیچے  
اپنے بازو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ اور سنکیر کے درختوں کی اس قطار کو دیکھنے  
لگا۔ جس کے شعاعہ بداماں پھول ندی کے بہاؤ میں خوبصورت چراغوں کی طرح  
جگمگا رہے تھے۔ پانی کا مترنم بہاؤ ایک سریلے گیت کی طرح ان حسین شمعوں کے  
گردارزنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اسے عذرا بہن کا وہ ناچ یاد آیا۔ جب وہ مومی  
شمعوں کے ہارے میں رقص کرتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ ماڈونا کی مسکراہٹ  
اور کرسمس کی مومی شمعیں۔ خدا جانے اسے کیونکر ان ہندی عورتوں کے  
چہرے ماڈونا کے سے معلوم ہوتے ہیں کیوں بہ زمین اس کی جانی پہچانی معلوم  
ہوتی ہے کیوں یہ لوگ اسے اپنے بھائی بند ہی نظر آتے ہیں۔ یہ پیر، یہ زمین، یہ  
سبزہ، یہ ندی۔ یہ مغربی گھاٹ کی نیلی چوٹیوں کی افق سے اترتی ہوئی قطار، جیسے  
کنواریاں سرسبز گھڑے لئے کسی گھاٹی کی آغوش میں پنچھندی کو جا رہی ہوں۔ یہ



جرو سلم ہے یا ڈھل و اُڑی۔ ہ مندر کا سنہری کلس اور اس کا ترسول اس کی آنکھوں  
 میں چپکنے لگا۔ ترسول، صلیب ہی تو ہے..... ہال وہی تو ہے۔! یہ مندر جو  
 ندی کے کنارے ہے۔ یہ شفق جو ندی میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کسان جو ندی کے  
 کنارے اپنے کھیت میں ہل چلا رہا ہے۔ کیوں وہ اس منظر سے مدیوں سے واقف  
 ہے۔؟ اور واقف ہو کر بھی آج تک ناواقف ہے۔ انسان اور زمین کی تصویر تو بہت  
 سادہ ہے۔ اس میں سبزہ ہے اور پانی ہے اور ہل ہے اور شفق کا سونا ہے اور عبادت  
 کے لئے ایک مندر ہے۔ اس معصوم تصویر میں کس لئے خونیں نقش و نگار ابھار  
 جا رہے ہیں۔! کس لئے کس لئے۔؟

بیکایک پرویز نے کہا۔

”موبی جب میں ندی کے کنارے اس مندر کو دیکھتا ہوں تو میرا جی  
 بے اختیار عبادت کرنے کو چاہتا ہے۔“  
 ”کس کی عبادت۔؟“ ممتاز نے شوخی سے پوچھا۔

موبی چیخا۔

”اوشبھی اوشبھی بوائے ادھر آنا عشق ہو رہا ہے۔“  
 شام کچھ دور جھاڑیوں پر سے چنبلی کے پھول چننے میں مصروف تھا۔  
 وہ رومال میں بہت سے پھول بھر کر لایا۔ اور آتے ہی اس نے یہ پھول ممتاز  
 اور پرویز کے سروں پر ڈال دیے۔

موبی جلدی سے ممتاز اور پرویز کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ایک  
 پارسی کی طرح شادی کا وظیفہ پڑھنے لگا کہ ممتاز نے جلدی سے ہاتھ چھڑا لیا



اور سب ہنسنے لگے۔

پتیل کی نگاہیں لئے مرہٹی لڑکیاں مندر کے قریب ایک خوشنما باؤلی پر آتی گئیں اور ان کی ساڑھیوں کے پنج رنگے کنارے مور کے چھتر کی طرح فضا میں ناچنے لگے۔

پرکاش آہ بھر کر کہنے لگا۔

”جب عورت مسکراتی ہے تو بھولوں پر شبنم چمکتی ہے۔ اور حشمتے کا پانی

گیت گانے لگتا ہے۔“

حمید نے کہا۔

”اٹو ہے بے تو، عورت کہیں نہیں ہے، یہ صرف مرد کا تخیل ہے۔“

عذرا بہن نے حمید کی طرف قہر بھری نگاہوں سے دیکھا۔

لڑکیاں پتیل کی نگاہیں سر پر رکھے گھائی کے اوپر چڑھتی جا رہی تھیں

گھائی چڑھ کر ان کا گائوں آتا تھا۔ گھائی کی پگڈنڈی ہندی کی لکیر تھی۔ جس کی

خاک سے کنواریاں سدا سہاگن ہوتی ہیں۔ وٹھل واڑی کا چشمہ امت ہے۔ وٹھل

واڑی کی زمین میں شکر گھلی ہوئی ہے۔ بھر وٹھل واڑی کے گنے اس دور میں کیوں

نہ ہوں۔ بھر کنواریوں کے گٹلے میں کیوں نہ رہیں ہو۔ وٹھل واڑی کے گیت گائے۔

وٹھل واڑی پیشواؤں کا سب سے سندر گائوں ہے۔“

پرکاش نے جب یہ گیت موبی کو سنایا تو وہ اچھل پڑا کہنے لگا۔

”شبی، اگر کوئی حرج نہ تو میں ان جھارٹوں کے پیچھے چھپ کر پگڈنڈی

پر چلتی ہوئی لڑکیوں کی تصویرے لوں۔“



”کیوں۔؟“ شام کا لہجہ شبہ سے خالی نہ تھا۔

”ہم واٹرورکس کے سماج میں رہتے ہیں بھائی۔“ موبی نے جواب دیا۔

”تم نہیں جانتے، میرے لئے یہ منظر کس قدر عجیب ہے۔!“

شام نے اجازت دیدی۔ موبی نے کیمروہ درست کیا اور پھر آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ہو کر چلا۔ آخر کار وہ ایک بڑی جھاڑی کے پیچھے غائب ہو گیا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ وہ اس جھاڑی کی طرف دیکھتے رہے اور گھائی میں لڑکیوں کا گیت گونجتا رہا۔

پھر جھاڑی کی اوٹ میں سے موبی کا سر بلند ہوا۔ اس نے زور سے ایک چیخ ماری۔ ”سانپ۔! سانپ۔!“ اور وہ پھر اسی جھاڑی میں غائب ہو گیا۔ سب لوگ اس کی طرف لپکے پھر رک گئے پھر بڑھے پھر چیخنے لگے ”سانپ۔! سانپ۔!“

پگڈنڈی پر چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم رک گئے بغیر بند ہو گیا۔ وہ جلدی جلدی نیچے اتر آئیں۔

موبی نے سانپ کا سر کھل دیا تھا۔ لیکن اس کا چہرہ سبز ہوتا جا رہا تھا۔ موبی نے کہا۔

”سانپ نے مجھے ————— کاٹ کھایا ہے۔ ————— دیکھو۔“  
 ”ٹانگ پر ————— ٹخنوں سے اوپر ————— جلد کا رنگ سبز ہوتا جا رہا تھا۔“

شام نے کیمروہ کا چرمی فیٹہ توڑ کر موبی کے گھٹنے کے اوپر کس کر باندھ دیا۔



ممتاز نے اپنا دوپٹہ شام کے ہاتھ میں دیدیا بھر کھنے لگی۔  
 ”پیاز کھلاؤ۔ اسے پیاز۔۔۔۔۔ اور بھاگی بھاگی آم کے پڑکے  
 نیچے پڑے ہوئے سامانِ خورد و نوش میں سے پیاز ڈھونڈھنے گئی۔  
 گھاؤں کی ایک لڑکی بولی۔ ”مگر یہ تو واقعی ہے، ہائے۔“  
 حمید نے گھبرا کر کہا۔

”اگر اس وقت کہیں سے موٹر مل جاتی۔“

پرکاش بولا۔

”موٹر تو اب شام کے سات بجے آئے گی۔“

گھاؤں کی ایک اور لڑکی بولی۔

”مگر یہ تو واقعی ہے یہ تو پانچ منٹ میں۔!“

موبی کی حالت ہر لحظہ غیر ہو رہی تھی۔

ایک دہلی تپلی سانوے رنگ کی لڑکی جھپکتے جھپکتے آگے بڑھی۔ اس نے

گناگر سر سے اتار کر زمین پر رکھ دی۔ اور پھر آگے بڑھ کر غور سے اس چھوٹے زخم کے منہ کو

دیکھنے لگی جو ٹخنوں سے اوپر کی جلد کو سبز کرتا جا رہا تھا۔ پیشیز اس کے کونوی سمجھے کہ

دوکیا کر رہی ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ اس زخم سے لگا دیے۔ اور ہر چوس کر تھوکر

دیا۔ ایک بار۔۔۔۔۔ دو بار۔۔۔۔۔ موبی نے اپنا پاؤں ہٹانا چاہا۔

مگر اس لڑکی نے پاؤں چھوڑا نہیں۔

تیسری بار وہ اچھل کر پرے ہو گیا اور لڑکی کی گناگر الٹ گئی اور تھوکر کھا کر

شوہر چپاتی ہوئی ڈھلوان کی جانب لڑھکتی گئی۔ لڑکی اپنی گناگر کی طرف بھاگی ندی



کے کنارے پہنچ کر اس نے اسے پھر پالیا۔ وہاں اس نے پانی سے سکلیاں کیں۔ ایک جڑی نوڑ کر کھائی۔ باؤلی سے پانی بھرا اور پھر گھائی پر چڑھنے لگی۔

ایک ایک موبی نے کہا۔

”باٹ سنو۔“

لڑکی رک گئی اور چپ چاپ اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”تمہارا نام۔“

لڑکی نے شرماتا ہوا منہ پر سے کہہ لیا۔ دوسری لڑکی نے آہستہ سے کہا۔

”موسنی اس کا نام ہے۔ مگر یہ گونگی ہے۔“ وہ موسنی اور موسنی کی نگاہیں بین پر جھک گئیں۔

”میں اس کے ماں باپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ موبی نے کہا۔

ایک لڑکی نے بتایا۔ ”اس کے ماں باپ مر گئے ہیں۔ یہ اپنے چچا کے ہاں رہتی ہے۔“

موبی نے شام سے کہا۔

”مگر — اس لڑکی کو فوراً میرے ساتھ ہسپتال لے چلنا چاہیے۔“

شام نے کہا۔ ”چپ رہو بھوتنی کے۔“

لڑکیاں جلدی جلدی آگے بڑھ گئیں۔ موبی وہیں دیر تک محو حیرت.....!



ہسپتال میں موبی سے ڈاکٹر نے کہا: "اچھا ہوا اس لڑکی نے زہر چوس لیا۔  
 اور اگلے دیا۔ ورنہ تمہاری جان نہ بچتی۔"  
 "مگر میں نے تو سانپ کے کاٹے کا انجکشن ہندوستان آتے ہی لے لیا تھا۔"  
 "اس انجکشن میں اس سانپ کے زہر کا تریاق شامل نہیں۔" ڈاکٹر اس  
 چھوٹے سے سانپ کے کھیلے ہوئے سر کا معائنہ کرنے لگا۔ "جاؤ۔۔۔۔۔  
 اب تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں۔"

موبی کے لبوں پر ایک نام آیا۔ "موسمی۔!"  
 "چپ رہ بھوتنی کے۔!" شام نے کہا۔



پھر جب موبی شام کے گھر آیا تو جاپانیوں نے آسام پر حملہ کر دیا تھا۔ اور  
 اسے واپس آسام جانے کا بلاوا آچکا تھا۔ اگلی صبح وہ آسام جا رہا تھا۔  
 پرکاش بھی فوج میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ بھی اگلے دن ہی جا رہا تھا۔  
 محفل ادا اس تھی۔ ممتاز کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے۔ حمید بھی آج  
 سگریٹ کی بجائے سگار پی رہا تھا۔ عذرا بہن کی آنکھوں کی متانت اور بھی دبیر  
 ہو گئی تھی۔ وہ نیلیاں آج بے حد سرا سرائیں۔

موبی جو ہمیشہ چپکنا تھا۔ آج خاموشی کی حد تک کم گو تھا۔

پر دینے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تم تو پرل ہاربر کے لئے لڑ رہے ہو۔ لیکن یہ پرکاش کیوں لڑ رہا ہے۔"







پرکاش نے تشکر آمیز نگاہوں سے ممتاز کی طرف دیکھا۔  
 ”میں مرنے کے لئے جا رہا ہوں، اب واپس نہیں آؤں گا۔ میں جا پانی  
 فسطائیت کے خلاف اپنا خون بہانے جا رہا ہوں۔“  
 سب ہنس پڑے۔ موہی خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔  
 پرکاش نے کہا۔

”آج مدت کے بعد پے لسٹ پینے کو ملی ہے۔ زبان زرس گئی تھی۔ اس  
 کے ذائقے کو۔“

حمید نے کہا۔ ”شاباش بیٹا، مرنے سے پہلے جی بھر کر پی لو۔“  
 پرکاش کہہ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے آپ سے ہمکلام ہو۔ ”جب  
 میں ذہنی دورا ہے پر آگیا تو سوچتا تھا کیا کروں۔؟ فرنگی فسطائیت اچھی ہے نہ جا پانی  
 پھر۔؟ کیا کروں۔؟ چپکا بیٹھا رہوں۔؟ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسی کرناک ثنویت کا  
 شکار بنا رہوں۔ اپنے ملک میں انگریزوں اور جا پانیوں کو لڑتا دیکھوں۔؟ اپنے کھیتوں  
 کو، اپنے گاؤں اپنے شہروں کو اجڑنا دیکھوں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے خاموش بیٹھا  
 رہوں۔؟ غلامی کے بعد بے حیالی اور ڈھٹائی کی منزل آتی ہے۔ اور اس منزل  
 پر پہنچ کر ہر قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ غلامی سے آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی  
 قوم غلامی کی حدود سے گزر کر بے حیالی ڈھٹائی اور بے عملی کا ثبوت دینے لگے۔ تو پھر  
 وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے تو میں جا پانی فسطائیت کے خلاف لڑ کر اپنا  
 خون بہا دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ اقدام فسطائیت کے سارے ظالمانہ نظام کے خلاف  
 ہو گا۔ چاہے وہ دینا کے کسی حصے میں کیوں نہ واقع ہو۔ چاہے ان کے اثرات بعض



اتحادیوں ہی میں نمایاں کیوں نہ ہوں۔ میری موت، میری لڑائی اس فسطائیت کو بھی ضرور کمزور کرے گی۔ جس کی ایک جھلک شاید ہمیں اپنے گھر میں بھی ملتی ہے۔  
پرکاش یکا یک چپ ہو گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے بیڑ کا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔

پر دینے لگے کہا۔

”فرنگی سے کیوں نہیں اڑتے؟ یہ بھی تو محمل نہیں، ریشم نہیں، دیبا نہیں۔“  
حمید نے کہا۔

”غالباً پرکاش دو محاذ پر بیک وقت لڑنا نہیں چاہتا۔ ہسلر کا حشر تم دیکھ رہے ہو۔“

سب سننے لگے۔ مولیٰ چپ تھا۔

شام نے کہا۔ ”بھوتنی کے تم نہیں بولو گے۔“  
مولیٰ نے کہا۔

”جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، میں خاموش رہوں گا۔ جو ہدایات مجھے ملی ہیں حتیٰ اوسع ان کی پابندی کروں گا۔“ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ جب میں آیا تو مجھے بہت سی ایسی باتیں کہی گئی تھیں۔ جو ہندوستانی سماج کے متعلق تھیں۔ اور جو بعد میں شاہدے اور تجربے سے غلط ثابت ہوئیں۔ ممکن ہے آج میں ان باتوں کا یہاں اقرار نہ کرتا۔ لیکن فرنٹ پر جا رہا ہوں۔“

سب چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔

”مجھے بتایا گیا تھا کہ ہندوستانی عورتیں بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں۔“



وہ پردے میں رہتی ہیں۔ اور سفید آدمی کے ساٹے سے بھی گھبراتی ہیں۔ اب  
 میں جانتا ہوں کہ حقیقت کیا ہے۔۔۔۔۔ وہ پردے میں بے شک رہتی ہوں۔  
 وہ جیسا پردہ ہیں۔ لیکن ڈرپک نہیں۔ وہ تمہارے مردوں سے زیادہ دلیر ہیں۔  
 وہ موت کا مقابلہ بھی کر سکتی ہیں۔ اگر ضرورت پڑے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔  
 حمید نے طنزاً کہا۔

"موبی نہیں بول رہا۔ سانپ کا زیر بول رہا ہے۔"  
 موبی نے کہا۔

"ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ دوسروں کی بری باتیں سننے اور ان پر اعتبار کرے۔  
 یہ انسانی فطرت ہے۔ اسی طرح میں نے بھی تمہارے متعلق بہت سی بری باتیں سنیں  
 اور ان پر اعتبار بھی کر لیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شیمی نہیں وہ تحفے خائف والی بات یاد  
 ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم مجھے کہتے سمجھو گے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ میں آج دن  
 تک تمہارے طرز عمل کو اسی کسوٹی پر پرکھتا رہا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر یہ کلیہ بھی غلط  
 نکلا۔"

"غلط کیسے۔؟" شام نے کہا۔

"بھوتنہ کئے۔ یہ بے لبت جو پلا رہے ہو۔ چالیس روپے کی تو یہ اکیلی بیڑ  
 ہی ہوگی۔ اس پر بھی کہتے ہو۔ ہم مالی فائدہ حاصل نہیں کرتے کیا بیڑ سے اتنا لٹہ  
 ہو جاتا ہے۔ نہیں۔؟"

موبی مسکرایا کہنے لگا۔

"بین سیاست نہیں جانتے ہوں صرف میں دیکھتا ہوں دل بہلاتا۔"



ہوں۔ میں نے تمہارے دلوں کو بھی اچھی طرح ٹول ٹول کر دیکھا ہے۔

جب میں واپس امریکہ جاؤں گا تو۔۔۔۔۔

"تو کیا ہوگا۔؟" پرویز نے پوچھا۔

موبی نے کہا۔ "کچھ نہیں۔۔۔۔۔ سنو! وہ۔۔۔۔۔ شاید کہیں

ببل بول رہی ہے۔"

"ببل بول رہی ہے۔؟ یہاں۔؟ موبی یہ تمہارا واسطہ ہے۔ یہاں مغربی

گھاٹ پر ببل نہیں بولتی۔" پرویز نے جواب دیا۔

قدرے توقف کے بعد موبی نے آہستہ سے کہا۔۔۔۔۔ "مگر بالکل

وہی آواز ہے۔۔۔۔۔ یہ نغمہ کہیں دور سے آیا ہے۔!" اس کی آنکھیں خوابیہ ہو گئیں۔

"نیو یارک سے۔؟" شام نے پوچھا۔

"ہاں نیو یارک سے بھی آسکتا ہے۔ جہاں میری محبوبہ رہتی ہے۔ اور اُدھی

اد سے بھی جہاں میز ماں رہتی ہے۔۔۔۔۔" موبی یادوں میں کھو گیا۔ "یہ میگنولیا

کے سپید غنچے میری محبوب کے رخساروں کی طرح تازہ ہیں۔۔۔۔۔ میری ماں کے

سپید بالوں کی طرح مقدس ہیں۔" موبی نے گلہ ان سے میگنولیا کے سپید غنچوں

کو چھوا۔ ہلکے، آہستہ، ملائم انداز میں جیسے وہ ان سے پیار کر رہا ہو۔

پرکاش سسکیاں لیتی لگا۔

موبی نے کہا۔ "شام میں سچ کہتا ہوں، میں پرل ہاربر کے لئے نہیں

لڑ رہا۔۔۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ "میں۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ ان سپید غنچوں



رہ رہا ہوں۔“

اور موبی نے میگنولیا کے سپید پھول اپنے رخساروں سے لگائے۔  
سب خاموش تھے۔ رات بھی خاموش تھی۔ صرف بیئر کا کف باقی تھا۔ اور  
دور کہیں بہت دور شاید کسی بیل کا نغمہ گونج رہا تھا۔

❖ ❖ ❖

کسی ماہ گزر گئے۔ موبی کا کوئی خط نہ آیا، شاید سنسر۔ !  
پرکاش بخیر رہا تھا۔

پھر نیچے چلا کہ پرکاش جاپانیوں کے خلاف لڑتے لڑتے مارا گیا۔ پھر بھی  
موبی کا کوئی خط نہ آیا۔

پرونیہ نے کہا: ”ان امریکیوں کا کیا اعتبار؟ یہاں پر کسی رفاقت خیلنا  
تھا۔ اور وہاں جا کر..... اس نے سگریٹ کی راکھ خالہ ان میں پھینک کر اپنی  
دانست میں موبی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا۔

چند مہینے ممتاز کی نگاہیں کھوٹی کھوٹی سی رہیں۔ پھر وہ بھی بھول گئی۔  
پھر شام ٹا بیضاؤں میں مبتلا ہو گیا۔ علالت کے دوران اسے ایک سنسر شدہ خط  
ملا۔ یہ خط ادھی اور ہی آیا تھا۔ خط کھولتے کھولتے شام نے سوچا۔ بد معاش  
واپس ادھی اور ہی پہنچ گیا ہے اور

❖ ❖ ❖



خط کی عبارت یہ تھی۔

پیارے بیٹے۔ !

میں تمہیں اپنا بیٹا کہہ رہی ہوں، کیونکہ تم میرے موبی کے دوست ہو۔ اس لئے میں تمہیں خط لکھ رہی ہوں ممکن ہے تم انہی ماں کی کچھ مدد کر سکو۔ موبی نے مرنے سے پہلے اپنی وصیت میں تحریر کیا تھا کہ اس نے وٹھل وارسی میں ایک لڑکی کو اپنی بہن مانا تھا۔ اس لڑکی کا نام ”موسنی“ ہے۔ موبی نے یہ بھی لکھا تھا کہ تم اس لڑکی کو اچھی طرح پہچانتے ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اب جبکہ موبی اس جہان میں نہیں ہے۔ تم میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔

اگر کسی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو تو بھی مجھے لکھو تاکہ میں خود ہی بندوستان آئینکا بند و بست کر سکوں۔ اگر زندگی نے ساتھ دیا تو میں ضرور آؤں گی۔ میں ”موسنی“ سے ملنا چاہتی ہوں۔ اور اگر ہو سکے تو اسے اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے۔ ؟  
یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم ایک امریکی عورت کی اس تخیل پرستی کو غلط سمجھو اور اسے کوری جنڈا ثابت پر محمول کرو۔ لیکن یہ کوری جنڈا ثابت ہے نہ محض تخیل پرستی۔ یہ اس خوبصورت حقیقت کا مشاہدہ ہے جسے میرے بیٹے نے اپنا خون دیکر حاصل کیا ہے۔ وہ میرا اکلوتا لڑکا تھا۔  
اپنے آخری خط میں اس نے لکھا کہ جس روز موسنی نے اس کے ”ٹخنوں سے زہر چوس لیا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا موسنی نے یہ زہر اس



کے جسم سے نہیں اس کی روح سے چوس کر باہر نکال دیا۔ وہ ہر جو کالے کو گورے سے، غریب کو امیر سے اور آدمی کو آدمی سے جدا رکھتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوا کہ محبت ہر خوبصورت انسانی سماج کی پہلی اور آخری شرط ہے۔ اور اس کے بغیر دنیا میں کوئی انسانی سماج قائم نہیں بن سکتا۔

دھمل واڑی کی گھاٹی پر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ محبت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا، کوئی ملک نہیں ہوتا، کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ زندگی کا آخری اور ابدی آدرش ہے۔ جب وہ آسام جا رہا تھا تو وہ تمہیں یہ سب کچھ بتانا چاہتا تھا لیکن اسقدر شرمیلانہ تھا کہ وہ — میرا بیٹا — وہ تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ بس اس محبت کے لئے لڑ رہا ہے۔ اس محبت کے لئے جو آدمیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نفرت کے خلاف جس کا منبع فسطائیت ہے۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ جنگ سے واپس آئے گا تو تمہیں بتا دے گا کہ ہم وطنوں کو بتائے گا۔ لیکن اب اس کی لاش آسام کی کسی گھاٹی کے سینے میں چھپی ہے اور اس کے سر پہ موت کی صلیب ہے۔ — ہر ماں کو اپنے بیٹے کی موت کا دکھ ہوتا ہے۔ اور پھر میرا تو وہ ایک ہی بیٹا تھا یہ مشیت ایزدی تھی کہ وہ مجھ سے یوں چھن جائے۔ لیکن اس کا آخری خط پڑھ کر مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کہیں کھو نہیں گیا۔ جیسے وہ اب بھی میرے پاس بیٹھا ہے اور مسکرا کر



مجھ سے کہہ رہا ہے۔ دیکھ ماں، تیرے لئے ایک بیٹی لایا ہوں۔  
 — اس کا خط پڑھ کر آج مجھے پھر اس عظیم درد اور  
 مسرت کا احساس ہو رہا ہے جیسے میں نے اپنے بیٹے کو پہلی بار جنم  
 دیا ہو۔ — بس اب اور کچھ نہیں لکھ سکتی۔

تمہاری ماں  
 البتہ

پرویز بھی شام کے قریب جھکا ہوا یہ خط پڑھ رہا تھا۔ خط پڑھتے  
 پڑھتے اس کی انگلیاں سختی سے شام کے ہاتھ پر جم گئیں۔ اور اس کے منہ سے  
 نکلا۔ "موہی!"

شام نے اپنا منہ موڑ لیا۔ اور آلتو پوٹھتے ہوئے اپنے کانپتے ہوئے  
 ہاتھوں سے اس نے میگنولیا کے سپید غنچے اپنے رخساروں سے لگا لئے۔  
 رات خاموش تھی، پھول بھی خاموش تھے۔ — صرف  
 دور کہیں بہت دور شاید کوئی بلبیل نغمہ رنہ رنہ تھی۔



# بھگت رام

ابھی ابھی میرے بچے نے میرے بائیں ہاتھ کی چٹکیا کو اپنے دانتوں تلے داب کر اس زور سے کاٹا کہ میں چلائے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے غصہ میں آکر اس کے دو تین ٹکڑے بھی جڑ دیے۔ بیچارہ اسی وقت سے ایک معصوم بچے کی طرح چلا رہا ہے۔ یہ بچے کمبخت دیکھنے میں کتنے نازک ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے ننھے ننھے ہاتھوں کی گرفت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ ان کے دانت یوں تو دودھ کے ہوتے ہیں۔ لیکن کاٹنے میں گلہریوں کو بھی مات کرتے ہیں۔ اس بچے کی معصوم شرارت سے معاً میرے دل میں بچپن کا ایک واقعہ ابھر آیا ہے۔ اب تک میں اسے بہت معمولی واقعہ سمجھتا تھا۔ اور اپنی دانت میں اسے قطعاً بھلا چکا تھا۔ لیکن دیکھئے یہ لاشعور کا فتنہ بھی کس قدر عجیب ہے۔ اس کے سائے میں بھی کیسے کیسے خفہ عجائب مسطور ہیں۔ بظاہر اتنی سی بات تھی کہ بچپن میں میں نے ایک دفعہ اپنے گاؤں کے ایک آدمی بھگت رام کے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا ڈالا اور اس نے مجھے ٹکڑے مارنے کے بجائے سیب اور آلو چے کھلائے تھے۔ اور بظاہر



میں اس واقعہ کو اب تک بھول چکا تھا لیکن ذرا اس سببان متنی کے پڑارے کی بوا عجبیاں  
 ملاحظہ فرمائیے۔ یہ معمولی سا واقعہ ایک خوابیدہ ناگ کی طرح ذہن کے پشتارے میں  
 دبا ہے اور جو نہیں میرا بچہ میری چھنگلیا کو دانٹوں تلے دبانا ہے۔ اور میں اسے پتیا ہوں۔  
 یہ پچیس تیس سال کا سویا ہوا ناگ بیدار ہو جاتا ہے۔ اور پھین پھیلا کر میرے ذہن کی  
 چار دیواری میں لہرانے لگتا ہے۔ اب کوئی اسے کس طرح مار بھگائے۔ اب تو اسے دودھ  
 پلانا ہو گا۔ خیر تو وہ واقعہ بھی سن لیجئے جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں یہ میرے  
 بچپن کا واقعہ ہے جب ہم لوگ رنگپور کے گاؤں میں رہتے تھے۔ رنگپور کا گاؤں تحصیل  
 جوڑی کا صدر مقام ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت اب ایک چھوٹے موٹے قصبے کی ہے  
 لیکن جن دنوں ہم وہاں رہتے تھے۔ رنگپور کی آبادی بہت زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی  
 ڈھائی تین سو گھروں پر مشتمل ہو گئی جن میں بیشتر گھر برہمنوں اور کھتریوں کے تھے۔ دس  
 بارہ گھر جلاہوں کے اور کمہاروں کے ہونگے۔ پانچ چھ بڑھئی اتنے ہی چار اور دھوبی  
 اور یہی سارے گاؤں میں لے دے کے آٹھ دس گھر مسلمانوں کے ہوں گے۔ لیکن ان کی  
 حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اس لئے یہاں تو ان کا ذکر کرنا بھی بیکار سا معلوم ہوتا ہے۔  
 گاؤں کی برادری کے مکھیالالہ کانشی رام تھے۔ یوں تو براہمنی سماج کے  
 اصولوں کے مطابق برادری کا مکھیالالہ کسی براہمن ہی کو ہونا چاہیے تھا۔ اور پھر برہمنوں  
 کی آبادی بھی گاؤں میں سب سے زیادہ تھی۔ اس پر بھی برادری نے لالہ کانشی رام  
 جو ذات کے کھتری تھے۔ اپنا مکھیالالہ بنا لیا تھا۔ پھر وہ سب سے زیادہ لکھے پڑھے تھے یعنی  
 شہر تک پڑھے تھے جو خط ڈاکیہ نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اسے بھی وہ اچھی طرح پڑھ لیتے تھے  
 تمک ہندری: ناش برہمن۔ گواہی نشان دہی کے علاوہ شہر کی بڑی عدالت کی



کارروائی سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اس لئے گاؤں کا ہر فرد اپنی معیبت میں چاہے وہ  
خود لالہ کانشی رام کی ہی پیدا کردہ کیوں نہ ہو۔ لالہ کانشی رام ہی کا سہارا ڈھونڈتا تھا۔  
اور لالہ جی نے آج تک اپنے کسی مقروض کی مدد کرنے سے انکار نہ کیا۔ اسی لئے وہ گاؤں  
کے لکھیا تھے۔ گاؤں کے مالک تھے۔ اور رنگپور سے باہر بھی دور دور تک جہاں تک  
دھان کے کھیت دکھائی دیتے تھے۔ لوگ ان کا جس گاتے تھے۔

ایسے شریف لالہ کا منجھلا بھائی تھا لالہ کانشی رام، جو اپنے بڑے بھائی کے  
ہر نیک کام میں ہاتھ بٹاتا تھا لیکن گاؤں کے لوگ اسے اتنا اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ  
اس نے اپنے بہن و صہرام کو تیاگ دیا تھا۔ اور گورونانک جی کے چلائے ہوئے پنڈھ میں  
شامل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا گوردوارہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ اور اُسے  
شہر سے ایک نیک صورت نیک طبیعت نیک سیرت گرنٹھی کو بلا کر اسے گاؤں میں سکھ  
مت کے پرچار کے لئے مامور کر دیا تھا۔

لالہ کانشی رام کے سکھ بن جانے سے گاؤں میں جھگڑے اور حلال کا سوال پیدا  
ہو گیا تھا۔ مسلمانوں اور سکھوں کے لئے تو گویا ایک مذہبی سوال تھا لیکن بھیر گروں  
اور مرغیوں کے لئے تو زندگی اور موت کا سوال تھا لیکن انسانوں کے لئے تو خانے  
میں جانوروں کی آواز کون سنتا ہے۔

لالہ کانشی رام کے چھوٹے بھائی کا نام تھا بھگت رام۔ یہ وہی شخص ہے  
جس کا انگوٹھا میں نے بچپن میں چبا ڈالا تھا۔ کس طرح یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ ابھی تو  
اس کا کردار دیکھیے۔ یعنی کہ سخت لفنگا، آوارہ، بد معاش تھا۔ یہ شخص نام  
تھا بھگت رام لیکن دراصل یہ آدمی رام کا بھگت نہیں شیطان کا بھگت تھا۔ رنگپور کے



گناہوں میں آوارگی، بد معاشی ہی نہیں۔ ڈھٹائی اور بے حیائی کا نام اگر زندہ تھا تو محض  
بھگت رام کے وجود سے، ورنہ رنگپور تو ایسی شریف روحوں کا گناہوں کا گناہ غالباً فرشتوں  
کو بھی وہاں آتے ہوئے در معلوم ہوتا ہوگا۔

نیکی اور پاکیزگی اور عبادت کا ہلکا ہلکا سا نور گویا ہر ذی نفس کے چہرے  
سے چھٹا نظر آتا تھا کبھی کوئی لڑائی نہ ہوتی تھی۔ فرضہ وقت پر وصول ہو جاتا تھا۔ ورنہ  
زمین قرق ہو جاتی تھی۔ اور لالہ کانشی رام پھر روپیہ پکڑ اپنے مقروض کو پھر کام پر لگا دیتے  
تھے۔ مسلمان بے چارے اتنے کمزور تھے اور تعداد میں اس قدر کم تھے ان میں لڑنے کی ہمت  
نہ تھی۔ سب بیٹھے مسجدوں کے مناروں اور اس کے کنگروں کو خاموشی سے تاکا کرتے  
کیونکہ گناہوں میں انہیں اذان دینے کی بھی ممانعت تھی۔

کمیروں اور اچھوتوں کا سارا دھندا دھنمے لوگوں سے وابستہ تھا۔ اور  
وہ چوں تک نہ کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں یہ احساس بھی نہ تھا کہ زندگی اس  
کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔ بس جو ہے وہ ٹھیک ہے۔ یہی مسلمان سمجھتے تھے۔ یہی  
براہمن یہی کھتری۔ یہی چمار اور سب مل کر بھگت رام کو گالیاں سناتے تھے کیونکہ  
اس کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔

بھگت رام لٹھ گنوار تھا۔ بات کرنے میں اکھڑا۔ دیکھنے میں  
اکھڑا۔ کندہ نا تراش، بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، بڑے بڑے دانت تیلیسی  
ہر وقت کھلی ہوئی، لیوں سے رال ٹپکتی ہوئی۔ جب ہنستا تو ہنسی کے ساتھ مسوڑھوں  
کی بھی پوری پوری نمائش ہوتی۔ گناہوں میں ہر شخص کا سر گھٹا ہوا تھا اور ہر بندو کے  
سر پر چوٹی تھی۔ لیکن بھگت رام نے بلوچوں کی طرح لمبے لمبے بال بڑھائے تھے اور



چوٹی غائب تھی۔ بالوں میں بڑی کثرت سے جوہیں ہونیں جنہیں وہ اکثر گھراٹ کے باہر بھیج کر چپا کرتا تھا۔ سرسوں کا تیل سر میں دو تین بار چا یا جاتا۔ گٹلے میں کھیلوں کے ہار دالے جاتے اور بیچ میں سے سیدھی مانگ نکال کر اور زلفیں سنوار کر وہ سر شام گھاؤں کے حتمیوں کا لٹواں کیا کرتا۔ اپنی ان بری حرکتوں سے کسی بار پٹ چکا تھا لیکن اس کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ بڑی موٹی کھال تھی۔ اور اس کی اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کے شعور میں ضمیر کی آگ کبھی روشن ہی نہ ہوئی تھی۔ وہ شرارہ ناپید تھا۔ جو حیوان کو انسان بنا دیتا ہے۔ بھگت رام سو فیصدی حیوان تھا۔ اور اسی لئے گھاؤں والے برہمن اور کھتری امیر اور غریب، اور ہندو، مسلمان، سار اور چمار سب اس سے نفرت کرتے تھے۔

لیکن چونکہ لالہ کانشی رام کا چھوٹا بھائی تھا اور بظاہر گھاؤں کے سب سے بڑے گھر کا ایک معزز فرد۔ اس لئے اپنی ناپسندیدگی کے باوجود گھاؤں کے لوگ اس کے وجود کو اور اس کے وجود کی مذہبی حرکات کو برداشت کرتے تھے۔ اور آج تک کرتے چلے آئے تھے لیکن جب ہم رنگپور میں آئے۔ اس وقت بھگت رام کے بڑے بھائی نے پریشان ہو کر اسے اپنے گھر سے نکال دیا تھا۔ اور قوی کا ایک گھراٹ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ جہاں بھگت رام کام کرتا تھا۔ اور وہ رات کو سوتا بھی وہیں تھا۔ کیونکہ گھراٹ تو دن رات چلتا ہے نہ جانے کس وقت کسے آنا پسوانے کی ضرورت درپیش ہو اور وہ چادر میں یا بھڑکی کھال میں مکئی یا گندم کے دانے ڈالے گھراٹ پر چلا آئے۔ اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ دن بھر میں گہریں جتنا بھی جمع ہوتا ہے یا جو اناج ابھی پس نہیں جاتا وہ بھی وہیں گھراٹ پر دھرا رہتا ہے۔ اور اسکی نگہبانی کے لئے بھی تو



ایک آدمی کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔ یہی سوچ کر لالہ کانشی رام نے اپنے چھوٹے  
 بھائی بھگت رام کو اپنے گھراٹ کا کام سونپ دیا۔ اور لالہ کانشی رام کا گھراٹ گاؤں  
 میں سب سے نامی گھراٹ تھا۔ یعنی تقریباً سارے گاؤں کا اناج وہیں پسایا جاتا تھا۔  
 ایک اور گھراٹ بھی تھا۔ لیکن وہاں بالعموم مسلمانوں، اچھوتوں اور کیردوں کیلئے اناج  
 پسایا جاتا تھا۔ یا جب کبھی بڑا گھراٹ چلتے چلتے رک جاتا اور اس کی مہیب چکی کا  
 کرنے سے انکار کر دیتی یا جب پاؤں کی سطح پر پتھر لیے دندانے بنانے کے لئے انہیں  
 اٹا دیا جاتا تو اس صورت میں دوسرے گھراٹ والوں کو چند روز کے لئے اچھی  
 آمدنی ہو جاتی تھی۔ بصورت دیگر بڑے گھراٹ پر گاہکوں کی بھیڑ لگی رہتی۔  
 جب بڑا گھراٹ چلتا تھا۔ اس وقت کسی مسلمان کسی کیرے کسی اچھوت کی  
 یہ جرات نہ تھی۔ جرات تو کیا بھی ان کے ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا اناج  
 کبھی بڑے گھراٹ پر پس سکتا ہے۔

شروع شروع میں جب بھگت رام نے کام سنبھالا تو اس نے کچھ چند  
 روز تک یہی طریقہ اختیار کیا۔ لیکن بعد میں اس کے مزاج کے لاابالی پن نے بلکہ یوں  
 کہیے کہ شیطان پن نے زور مارا اور اس نے سوچا چلو حتی کیا ہے۔ اس میں جو آئے  
 آٹا پسارے جائے۔ ان پتھر کے دو پاٹوں میں دھرا سی کیا ہے اور یہ آخر اناج ہی  
 تو ہے جسے کتنا بھی کھاتا ہے اس سے گھراٹ کی آمدنی میں اضافہ بھی ہوگا اور دوسرے  
 گھراٹ کا حال جو پہلے ہی بہت تپلا ہے اور بھی تپلا ہو جائیگا۔ اور عین ممکن ہے کہ دوسرا گھراٹ  
 بالکل ہی بند ہو جائے۔ جانے اس نے کیا سوچا۔ بہر حال اس نے کوئی ایسی ہی بری  
 بات سوچی ہوگی۔ جو اس نے گاؤں کے چہاروں اور کیردوں کو بھی اپنے گھراٹ



پر سے آٹا پسانے کی دعوت دی۔

پہلے تو لوگوں نے بڑی شد و مد سے انکار کیا ————— "بھلا ایسا  
 بھی ہو سکتا ہے۔ کیا کہتے ہو لالہ۔ ہم رعیت ہیں۔ تم راجہ ہو یہ تمہارا گھراٹ ہے۔  
 ہمارا گھراٹ وہ ہے ————— ہم بھلا یہاں آٹا پسانے کیوں آئیں۔ بڑا بابا یہ کام  
 ہم سے نہ ہو گا۔ اور جو چاہے ہم سے کام لے لو۔ پر یہ کام ہم سے نہیں ہونے کا۔"  
 لیکن بھگت رام نے آخر اپنی چالاکیوں سے ان بیچاروں کو بھلا ہی  
 لیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اناج اسی کے گھراٹ پر لایا کریں گے اور  
 وہیں پسایا کریں گے۔

بھلا ایسی بات بھی برادری میں چھپی رہ سکتی ہے۔ برادری میں ایک کھرام  
 مچ گیا۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر روز بھگت رام سے لڑائی ہونے لگی۔ بنگرا  
 آدمی تھا۔ اس لئے نکالیاں سہ گیا۔ ہنس ہنس کر مانتا گیا۔ پھر اس نے غصہ میں آکر  
 دو چار کوپرٹ دیا۔ پھر ایک دن خود پٹیا گیا۔ یہ معاملہ بڑھتے بڑھتے لالہ کا نشی رام  
 کے پاس پہنچا۔ انہوں نے بھگت رام کو بلا کر ڈانٹا سمجھایا۔ بھجھیا یا ٹھنڈے دل سے  
 نرمی سے چپکار کر باتیں کیں۔ اونچ نیچ سمجھائی۔

لیکن جس کے دل میں کینہ بن ہو۔ وہ دھرم کرم کی بات کب سنے گا۔  
 بھگت رام نے اس کان سے نکال دی۔ پہلے جب بھگت رام اپنے گھر پر رہتا تھا۔  
 اس کے لئے تھوڑی بہت روک ٹوک بھی تھی۔ یہ ڈر بھی تھا کہ بڑے بھائی کیسا  
 کہیں گے لیکن اب تو وہ رات دن گھراٹ پر رہتا تھا۔ اب اسے وہاں روکنے والا کون  
 تھا۔ اب وہ خود کفیل تھا۔ انہی دنوں وہ بھنگ پینے لگا۔ اور ایک مسلمان فقیر کے ہاں



آنا جانا شروع کیا۔ جوان دنوں اپنی بیوی اور ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ ندی کنارے ایک تکیے پر آکر ٹھہرا تھا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے۔ بھگت رام گھراٹ کے کام کاج سے غافل رہنے لگا۔ اور دن کا بیشتر حصہ تکیے پر چرس اور گانجا پینے میں گزارنے لگا۔ بھائی نے بہتیرا سمجھایا۔ خود گاؤں کے شریف مسلمانوں نے اس پر نفرت کے آوازے کئے۔ لیکن وہ تو کسی اور ہی نشے میں چور تھا۔ چند دن اور گزرے اور پھر پتہ چلا کہ بھگت رام نے نئے شہر جا کر اس مسلمان فقیر کی بیٹی سے نکاح کر لیا ہے۔ اور اسلام قبول کر لیا ہے۔ سارے گاؤں میں ہل چل سی مح گئی۔

جب انہوں نے بھگت رام کو سیاہ سمپند نے والی سرخ رنگ کی اونچی ٹوپی پہنے ہوئے دیکھا۔ فقیر تو خبر ڈر کے مارے پھر کبھی اس گاؤں میں گھاہی نہیں اور یہ اس نے اچھا ہی کیا۔ ورنہ لالہ کانشی رام اور باناشی رام ضرور اس سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے۔

لیکن انہیں بھائی کو اب وہ کیا سکتے تھے۔ جو اپنی بیوی کو لیکر پھر گاؤں میں آگیا تھا۔ اور گھراٹ میں اپنے بڑے بھائی کے گھراٹ میں آکر بس گیا تھا۔ دونوں بیاں بیوی یہیں رہتے تھے۔ اور بھگت رام اب براہوش تھا اور سفید لٹھے کی شلووار اور سیاہ چکن کی واسکٹ جس پر کئی سو گھنٹہ سی دار بن لگے ہوئے تھے۔ گاؤں کی گلیوں میں فخریہ گھومنا تھا۔ اور گاؤں کی بہو بیٹیوں پر بلا امتیاز مذہب دلت آوازے کرتا تھا۔ ایسا دس نمبر کا بد معاش تھا۔ وہ کہ میری ماں جب مجھے گالی دیا کرتی تھی۔ تو میرے خصال کا نقابہ بھگت رام کے اوصاف حیدر سے کیا کرتی اور میں ہمیشہ رو دنیا بھگت رام سے مجھے



سمت چڑھتی۔ ایک تو اس نے ہمارا دھرم چھوڑ دیا تھا۔ بھلا ایسے آدمی کا کیا اعتبار اور  
 بھگت رام کی شیطنت دیکھو مسلمان ہوتے ہی اس نے گاؤں کے مسلمانوں کو اکسا کر شروع کیا  
 کہ وہ مسجد میں منارے پر چڑھ کر اذان دیں لیکن وہ تو بھلا ہو مسلمانوں کا کسی نے اس کی بات  
 نہیں مانی۔ اور درتے درتے کہا کہ گاؤں میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔ اس پر وہ  
 بد معاش بہت ہنسا اور اس نے خود وضو کر کے مسجد کے منارے پر چڑھ کر اذان دی۔ اور  
 اسکی گونجتی گرجتی ہوئی آواز وادی کی چوحدری میں ندی کنارے ناشپاتیوں کے جھنڈ میں اور  
 دور دور صنوبروں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کی چھاتیوں میں دھمک پیدا کرتی ہوئی گونج  
 گئی۔ اور گاؤں کے ہر رہنما اور کھتری کا دل ایک نامعلوم خوف سے بھر گیا۔ گھور کل جگ  
 ہے گھور کل جگ ہے۔ یہ ————— اب کوئی دن میں ضرور نش کلنکی اوتار پیدا ہوں گے۔

ہے رام ————— ہے رام ————— اور لالہ کانشی رام نے برہمنوں سے مشورہ  
 کر کے ایک بہت بڑا گیارہ کیا۔ اور پرالشیخت کیا۔ اور اپنے چھوٹے بھائی بھگت رام کو برادری  
 سے خارج اور جائداد سے بے دخل کر دیا۔ اور پرانے گھراٹ کے پانی کا بہاؤ موڑ کر ایک  
 اور عمدہ سا گھراٹ بنایا۔

پرانا گھراٹ جہاں اب بھگت رام اور اسکی بیوی رہتے تھے۔ اب بری حالت  
 حالت میں تھا۔ گاہک کم ہونے ہونے معدوم ہو گئے۔ مسلمانوں کے جو چند گھر باقی رہ  
 گئے تھے۔ انہوں نے بھی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ کیونکہ گاؤں کی سماجی زندگی میں بھگت رام  
 نے جا بجا سوراخ کر دیے تھے۔ اور اسے کوئی پسند نہ کرتا تھا۔

انہی دنوں بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونیوالا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ  
 فقیرن بیاہ سے پہلے ہی حاملہ تھی۔ اور وہ فقیر بھگت رام کو جبل دیکر خود فرار ہو گیا تھا۔



کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہاں یہ بات ضرور سچ تھی کہ بھگت رام ہر وقت اپنی بیوی کی دلی جوئی میں مصروف رہتا۔ وہ اس کے لئے ہر طرح کی محنت اور مشقت کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن گاؤں میں اب کوئی اسے کام دینے کیلئے تیار نہیں تھا۔ اور ایسے لوگ کیلئے بھلا اس شریف گاؤں میں کام کر سکی کیا سبیل ہو سکتی تھی۔

مجھے وہ رات نہیں بھولتی جب بھگت رام کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ صبح ہی سے بھگت رام نے ہمارے گھر کے چکر لگانے شروع کئے تھے۔ میری ماں کی منہیں کی تھیں۔ اور اس کے پاؤں پر اپنا ماسٹک کر رہا تھا۔

”تم چلو گی ماں تو میری بیوی بچہ جائے گی۔“ لیکن میری ماں نے جو بڑے بڑے کھڑی گھرانوں اور برہمنوں کے گھر میں دایہ بن کر جاتی تھی۔ بھگت رام کو ٹکاسا جواب دے دیا تھا۔

آدھی رات کے وقت بھگت رام نے چیخ چیخ کر دہائی دی۔ لیکن ہم لوگوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ اور مسٹ مار کر سو رہے۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ بھگت رام کی بیوی زچکی میں مر گئی۔ بچہ پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ بھگت رام بہت رو یا۔ زار و قطار رو یا۔ لیکن وہ کوئی سچے آنسو تھوڑے ہی تھے۔ کسی انسان کے آنسو تھوڑے ہی تھے۔ ایک حیوان کے آنسو تھے۔ جو یونہی اپنی تکلیف پر سوے بہا رہا ہو۔ کیونکہ چند دنوں میں ہی وہ اس فیکرتی کو بھول گیا تھا۔ اب اس نے اپنا مسلمانی نام بھی ترک کر دیا تھا۔ اب وہ پھر اپنے آپ کو خدا بخش نہیں بھگت رام کہتا تھا۔ اور اسی طرح گاؤں کی گلیوں میں چکر لگاتا تھا۔ لیکن شاہنشاہ ہندوؤں کو کسی نے اسے منہ نہیں لگایا جتنی کہ اس کے سہائی بھی اس سے بات تک کرنے کے روادار نہیں



ہوئے اور بھگت رام اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔

چند روز کے بعد بھگت رام گاؤں چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ تین چار مہینوں کے بعد جو ٹانوا اس کے پاس دو تین درجن سانپ تھے اور بہت سے چھوٹے درندہ اور نیوے اور ایسے ہی بہت سے جانور اور ایک پنجرے میں ایک خوبصورت مینا تھی جو بہت اچھا گاتی تھی۔ میں گھنٹوں اس مینا کے پنجرے کے قریب جا کر گانا سناتا تھا۔ اور گاؤں کے بہت سے لڑکے میرے ساتھ بھگت رام کے پاس آیا کرتے اور اب بھگت رام کے پاس بہت سی جڑی بوٹیاں تھیں جن کے متعلق وہ کہتا تھا کہ دنیا کی ہر بیماری کو یوں چٹکی میں دو کر سکتی ہیں۔ آہستہ آہستہ لوگ اس کی طرف کھینچنے لگے۔ اور اسے اچھی خاصی آمدنی ہونے لگی۔ میری ماں کو جو گاؤں کی مشہور دایہ تھیں۔ اور عورتوں کے ہر روگ کا علاج جانتی تھیں۔ بھگت رام کا یہ مہر و پ بہت برا معلوم ہوا۔ مگر وہ اب کیا کر سکتی تھیں۔ ہاں جب کبھی ان دونوں کی مڈ بھڑ ہو جاتی وہ اسے خوب کھری کھری سناتیں۔ بھگت رام یہ صلواتیں سکرمنس دیتا یا اپنا سر کھجانے لگتا۔ اور پھر ایک روز کا قبضہ لگا کر آگے چل دیتا۔ پر لے درجے کا چھٹا ہوا بد معاش تھا وہ۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ۔ بھگت رام کی جڑی بوٹیوں کی دھاک سارے گاؤں میں بندھ گئی پھر قرب و جوار کے پڑوسی اس کے پاس آنے لگے۔ اب اس نے گاؤں کے چھوٹے سے بازار میں ایک چمار کی آدھی دوکان کرائے پر لے لی۔ اور وہاں مٹی کے دوائیاں بیچنے لگا۔

آدھی دوکان میں مولو چمار جو تیاں بناتا تھا۔ مولو چمار اور اس کی بیوی اور اس کی بیوہ مہن رام دتی، بس یہ تینوں افراد ہر وقت جب دیکھو جو تیاں سننے رہتے تھے دوکان کے دوسرے حصے میں بھگت رام نے گاہکوں کو بٹھانے لگا تھا۔ اور سانپوں کا



نماشاد کھاتا تھا۔ اور اپنی زبان کو سانپوں سے ڈسواتا تھا۔ اور خود شکھیا کھا کر بتاتا تھا۔ کہ اس پر نہ ہر کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس ایسی تیز بیدار یوٹیاں تھیں۔ جو قاتل سے قاتل نہ ہر کے لئے تریاق کا حکم رکھتی ہیں بغرض اسی قسم کی جھوٹی گپیں ہانک کر اور شیخیاں بگھا کر وہ اجڑ گنوار اور سبھو لے بھالے دیہاتیوں سے ٹکے ہو جاتا تھا۔ اور میری ماں کو اس کی باتیں سن سن کر بہت آتا تھا۔ لیکن ہم لوگ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتے تھے کیونکہ لوگوں کو اس پر اعتقاد سا ہو گیا تھا۔ اور اب اس کی جیب میں روپے بھی تھے۔ اس نے گاؤں سے باہر ندی کے اس پار مٹی کا ایک کچا سا گھر بھی بنالیا تھا جہاں وہ فرصت کے وقت اپنا چھوٹا سا باغیچہ بنانے میں مصروف ہوتا۔ مجھے بھگت رام سے بڑی نفرت تھی۔ اور میں کبھی اس کے گھر نہ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ اس خوبصورت بنا کو جو دوکان کے باہر لٹکے ہوئے پھرے میں کافی رہتی تھی۔ اپنی گھر لے گیا تھا۔ اس لئے میں کبھی کبھی اس کے گھر محض اپنی مینا کو دیکھنے کے لئے چلا جا پاتا۔ خیریت ہوئی۔ اس نے مجھے ٹوکا نہیں۔ ورنہ میرا ارادہ تو یہ تھا کہ اگر اس نے مجھے کبھی ٹوکا تو گوپے میں ڈھیلا رکھ کر بھگت رام کا سر کھوڑ دوں گا۔

بھگت رام کا کام اب ترقی پڑتا تھا۔ لیکن انہی دنوں اس نے ایک ایسی حرکت کی کہ گاؤں کے لوگ پھر اس سے بدظن ہو گئے۔ اور اس واقعے کے بعد گاؤں میں اور قرب وجوار کے گاؤں میں کبھی اس کی ساکھ نہیں بندھی۔

واقعہ دراصل یہ تھا کہ رام دئی جو کہ مولو چمار کی بیوہ مہین تھی۔ لالہ بانسی رام نے درپردہ بھگت رام کو کہلا بھیجا تھا کہ وہ کوئی ایسی دوائی دے جس سے رام دئی کا حمل اسقاط ہو جائے۔ لیکن بھگت رام تو ایک چھٹا ہوا تھا۔ وہ بھلا ایسے موقع پر



کسی شریف آدمی کی کچھ نکر مدد کرتا۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے اس معاملہ کی یہاں تک تشہیر کی کہ لالہ بانسی رام کو چند ماہ کے لئے گاؤں چھوڑ کر نئے شہر جانا پڑا اور رام دلی کے لئے منہ چھپانا مشکل ہو گیا۔ یہ واقعہ اب اس قدر مشہور ہو چکا تھا کہ جب لالہ بانسی رام کے بڑے بھائی کانسی رام نے میری ماں کو جو ان کی خاندانی رانی تھی۔ اس نازک معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے کہا تو انہوں نے بھی صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے چارے رام دلی تو مہینے اس حرامی بیٹے کو اپنے پیٹ میں لئے لئے پھری اور گاؤں بھر میں اس کی بے عزتی ہوئی اور حرامی بچہ اس نے الگ جتا۔ اس پر اس کی برادری نے اسے "جات باہر" کر دیا۔ اور اس کے بھائی نے اور اس کی بیوی نے اسے گھر سے باہر نکال دیا۔ اس حالت میں جب اس کا کوئی بارود دکان نہ تھا۔ اور جب وہ کسی دن سے در بدر کی تھوکر میں کھاتی پھر رہی تھی۔ اور اپنے بچے کو دودھ دینے کے لئے خود اس کی چھاننیوں میں دودھ نہ رہا تھا۔ وہ بھگت رام کے گھر پہنچی۔ وہ بد معاش تو جیسے اس کے انتظار میں ہی تھا۔ اس نے جھٹ اسے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ اور بغیر کوئی شادی بیاہ کئے یہ نہی وہ لوگ سنسی خوشی رہنے لگے۔ گاؤں میں اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ یہ اندھیر گردی۔ یہ بے راہ روی ————— بے شرمی، بے حیائی۔ اپنی آنکھوں سے تو دیکھی نہ جاسکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھگت رام کی دوکان اٹھوادی گئی اور اسے اچھی طرح جتا دیا کہ اس واقعے کے بعد اگر وہ کبھی گاؤں کا رخ کریگا۔ تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

بھگت رام اب اپنے گھر ہی میں رہتا تھا اور باغیچے اور گھر کے آس پاس جو اس نے تھوڑی سی زمین مول لی تھی، اس میں کاشت کر کے اپنا اور رام دلی اور اس کے



حرامی بچے کا پیٹ پالتا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ بڑی ادا اس زندگی بسر کرتا ہو گا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے جیسے مکے گھرے پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ان تمام واقعات نے بھگت رام کی فطرت پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اس کی سرشت میں کوئی بھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اس نے کوئی گناہ بھی کیا ہے اسے اس امر کا خیال ہی نہیں تھا کہ اس نے اپنے طرز عمل سے اپنے ماں باپ، اپنے خاندان، اپنے گاؤں کی عزت کو بٹہ لگایا ہے۔ وہ اسی طرح خوش و خرم اور شاداں و فرحاں نظر آتا تھا کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ جیسے وہ اب بھی گاؤں کے اندر اپنے بھائی کے خوبصورت گھر میں رہتا ہو جس کی چھت میں کی تھی۔ میں نے ایک دن اسے اس کے گھر میں دوپہر کے وقت دیکھا تھا۔ وہ آنگن میں ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اور رام دئی کو چوم رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کسی مرد اور عورت کو چومتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے یہ منظر دیکھ کر میں تو ایک دم بھونچکا رہ گیا اور میرے کانوں میں ایک دم میری ماں کے الفاظ گونج گئے۔

”کبھی بھول کر بھی بھگت رام کے گھر کا رخ نہ کرنا وہ براہی بد معاش ہے۔“ میری ماں نے سچ کہا تھا بھلا شریف لوگ کہیں ایسے ہوتے ہیں غم و غصہ سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں واپس جانے کو تھا کہ میتھانے مجھے دیکھ لیا۔ اور جلدی سے چلانے لگی۔ ”آؤ نہ منے بالک مٹھائی دوں گی۔ آؤ نہ منے بالک مٹھائی دوں گی۔“ مینا کی آواز سن کر بھگت رام جلدی سے اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ شاید وہ مجھے پکڑنا چاہتا تھا۔ بد معاش میں تیرے قابو میں آسانی سے نہیں آؤں گا۔ خونی، ڈاکو، میں روتا ہوا آگے بھاگا۔ پیچھے پیچھے بھگت رام دوڑتا ہوا آ رہا تھا کہہ رہا تھا: ”بات تو سن، بیٹے،



بات تو سن بیٹے۔" پر میں ایسا بیوقوف نہ تھا کہ رک جاتا۔ میں بھاگتا گیا۔ یکایک اس نے مجھے گردن سے پکڑ لیا۔ اور میں نے کٹکٹا کر اس کے انگوٹھے کو اپنے دانتوں تلے دبایا۔ اور اتنے زور سے کاٹا کہ وہ درد کی شدت سے چیخ اٹھا۔ مگر اس نے مجھے طمانچہ نہیں مارے۔ کچھ نہیں کیا۔ لیکن مجھے چھوڑا بھی نہیں۔ وہ مجھ پر گھر کے اندر آنکھیں لے گیا۔ مجھے گردن سے پکڑے ہوئے تھا۔ کیمخت میں اب بھاگ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے رام دلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ تمہاری موسیٰ ہیں۔ انہیں رام رام کہو۔"  
میں نے کہا۔ "موسیٰ تمہاری ہوں گی۔ میں انہیں رام رام نہیں کہوں گا۔"  
اس نے ہنس کر کہا۔ "دیکھو یہ تمہارا چھوٹا بھائی ہے منو۔ اس کے ساتھ کھیلو۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کے ساتھ نہیں کھیلوں گا۔ میری ماں کہتی ہیں۔  
رام دلی کا بچہ حرامی ہے؛ حرامی ہے یہ بچہ۔۔۔۔۔!"  
معا رام دلی نے بچے کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ بھگت رام کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اس کے بد صورت کریمہ دانت اور مسوڑھے ہونٹوں کے باہر نکل آئے  
کہنے لگا۔ "سیدب کھاؤ گے۔؛ سیدب کھاؤ گے۔؛ آلوچے۔؛ آلوچے۔؛ ہا ہا ہا۔"  
میں نے سر ہٹا کر انکار کر دیا۔

اس نے زبردستی بہت سے سیدب اور آلوچے میری جیبوں میں ڈھکیں  
دیئے پھر سکر کر بولا۔ "یہ مینا تمہیں اچھی لگتی ہے نا۔ لے جاؤ اسے۔"  
وہ پنجبر اتار کر میرے حوالے کرنے لگا۔



میں نے کہا۔ کوئی تھوکتا بھی ہے اس تمہاری مینا پر میری ماں کہتی ہیں کہ  
بھگت رام آدمی نہیں حیوان ہے۔ وہ تو چاروں سے بھی بدتر ہے۔ چھوڑو مجھے۔ مجھے نہیں  
چاہیے تمہاری مینا وینا.....

اس نے ہنس کر مجھے چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ "تو اب بھاگ جاؤ۔"

اس بلا معاش کے نیچے سے نکل کر جو میں بھاگا ہوں تو سیدھا گھر آ کے دم لیا۔  
گھر آ کر ماں کو جو میں نے سارا قصہ سنایا تو پہلے تو مجھ پر بہت بگڑیں۔ پھر بھگت رام کو  
انہوں نے خوب خوب کو سا اور سارے سبب اور آلوچے اٹھا کر گلی میں پھینک دیے۔  
اس کے بعد میں کبھی بھگت رام کے گھر پر نہیں گیا۔

چند مہینوں کے بعد جب لالہ بانسہ رام نے شہر سے لوٹا تو اس نے  
میرے چار سے کہہ کر بھگت رام پر بد چلنی اور اغوا کا مقدمہ دائر کرا دیا۔ چند سات  
مہینے بھگت رام جیل میں رہا۔ آخر کار وہ برسی ہو گیا۔ لیکن جیل میں رہ کر اس کی صحت  
کافی کمزور ہو گئی تھی۔ اور اب وہ جیل سے چھوٹ کر آیا تو لوگ کہتے تھے کہ اس کے چہرے  
پر وہ پہلی سی بے شاشت نہ تھی۔ نہ وہ اب چلنے کی طرح سینہ تان کر چلتا تھا۔ کچھ جھکا  
جھکا سا تھا۔ کچھ ادا اس۔ لیکن یہ کیفیت بھی چند روز تک رہی۔ پھر وہ اسی طرح  
بے مثرم بے جیا اور ڈھیٹ بن کر ادھر ادھر گھومنے لگا۔ اور گاؤں گاؤں جا کر  
اپنی جڑی بوٹیوں کی تجارت کرنے لگا۔ لیکن شریف لوگ اسے منہ نہیں لگاتے  
تھے۔ اور اس کے سائے سے پرہیز کرتے تھے۔ ہندو، مسلمان، کیرے ہر مذہب اور  
ہر جات کے لوگ اسے آوارہ اور شہدا سمجھتے تھے۔ اور ہمارے گاؤں میں تو اس  
کی برائی ضرب المثل بن چکی تھی۔ اور مائیں ہمیں درس اخلاق دیتے وقت کہتا



کرتی تھیں۔

”دیکھو جی اگر کوئی برا کام کر دے تو تمہارا بھی وہی حال ہوگا، جو بھگت رام

کا ہوا ہے۔“

جیسی بے معنی، بے مطلب اس کی زندگی تھی، ویسی ہی اس کی موت تھی۔

بالکل مہمل، لایعنی.....

میں نے اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ لیکن جن لوگوں نے اسے مرتے ہوئے

دیکھا ہے۔ وہ بھی اس کے پاگل پن پر آجتک پہنچتے ہیں۔ کہتے ہیں مرنے سے پہلے وہ

بالکل ہشاش بشاش تھا۔ ندی کے کنارے رام دئی کے ساتھ کھڑا تھا۔ اور ان

طوفانی لہروں کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ جو برساتی بارش کی وجہ سے ندی کی سطح کو

”گرداب فنا“ بنائے ہوئے تھیں۔ یکایک اس نے اپنے کنارے کے قریب بھڑکے

تین چار بچوں کو دیکھا جو ان ہلاکت آفریں لہروں کی گود میں خوفزدہ آوازیں با آواز

کہتے ہوئے بہتے چلے آ رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے بھگت رام نے ان کی طرف دیکھا۔

دوسرے لمحے میں وہ ندی کی طوفانی لہروں کی آغوش میں سٹھا اور بھیر کے بچوں کو

بچانے کی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اسی کوشش میں اس نے اپنی جان بھی دیدی۔ دوسرے

دن جب طوفان ختم کیا تو اس کی لاش ندی کے غریبی ٹور پر تنگ کے ایک تنے سے

لپٹی ہوئی پائی گئی جس کا آدھا حصہ پانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیسی جاہلانہ، احمقانہ،

بیوقوفانہ موت تھی۔ یہ حیوانی زندگی کی حیوانی موت۔ حسن ترتیب اور حسن توازن

سے عاری۔ بھلا ایسی موت میں بھی کوئی تک ہے۔ لیکن اس کے

اچھے بھائیوں نے اچھا کیا۔ اسے معاف کر دیا۔ اور گودہ برداری سے خارج



ہو چکا تھا۔ اور اب وہ نہ ہندو رہا تھا نہ مسلمان نہ اچھوت کبھی انہوں نے اپنے دھرم کے مطابق اس سے اچھا سلوک کیا۔ وہ اس کی لاش کو گھر لے گئے۔ اسے نہلایا دھلایا اور اپنے رسم و رواج کے مطابق اسے شمشان گھاٹ لیجا کر آگ لگا دی۔ میں وقت وہیں موجود تھا۔ . . . .



لیکن یہ ۱۹۲۰ء کی بات ہے۔ آج ۱۹۴۴ء ہے اور میرے بچے بیٹے نے میری چھنگلیا کو زور سے کاٹ کھایا ہے اور میں نے غصہ میں آکر اسے دو تین لٹا پٹا خیر دیے ہیں۔ اور معصوم بچے صوفے میں منہ چھپائے رو رہا ہے اور میں سوچتا ہوں۔ آج میں یہ سوچتا ہوں کہ بھگت رام تم جو دس نمبر کے بد معاش تھے اور تمہارا کوئی مذہب نہ تھا۔ تم جو ایک گنوار، اجڑا، جھوٹے پیساری تھے اور جڑی بوٹیاں بچتے تھے۔ اور لوگوں کو ٹھگتے تھے۔ اور ان سے روپیہ پورتنے تھے۔ اور ایک مسلمان فیرنی سے نکاح کئے ہوئے تھے۔ اور ایک اچھوت بیوہ سے جھوٹا موٹا بیاہ رچائے ہوئے تھے بھگت رام تم جو جیل کی ہوا کھا چکے تھے۔ اور گاؤں بھر کے مانے ہوئے لفنگے اور غنڈے تھے۔ تم جس سے لوگ نفرت کرتے تھے۔ اور شاید آج بھی کرتے ہیں۔ ایک میرے ہی گاؤں میں نہیں ہر گاؤں، ہر شہر میں ہر جگہ ہیں۔ آج میں یہ سوچتا ہوں بھگت رام شاید میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ شاید میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی۔ شاید تم ان



تمام بڑے آدمیوں سے بڑے ہو۔ اچھے ہو۔ بہتر ہو۔ جو ریلیں بناتے ہیں۔ اور لوگوں کو بھوکا کر جانے دیتے ہیں۔ جلاوطنی اور پچی عمارتیں بناتے اور خدا کی مخلوق کو نگلیوں میں ننگا پھرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جو نادار عورتوں سے ان کی عصمت چھین کر عصمت پرست بنتے ہیں۔ جو اپنی وقتی بیویوں کے لئے فحش خانے اور اپنی اولاد کے لئے منیم خانے تعمیر کرتے ہیں اور سماج کے مندر میں مٹی کر ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔ ہاں تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو جو ٹریکٹر، ہوائی جہاز، اسکول مشین گن، ٹھیٹر سینما، ایمپائر بلڈنگ، ناچ گھر، نیک، یونیورسٹی، سلطنت تخت طاؤس، کتبے، آپشنر، فلسفہ، زبان اور ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور آدمی کی نسل کو کائنات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حیران و پریشان چھوڑ دیتے ہیں۔ تم ان سب آدمیوں سے بڑے ہو اچھے ہو۔ بھگت رام کیونکہ تم پنساہی ہو۔ جڑی بوٹی فروخت کرتے ہو۔ آوارہ مزاج ہو۔ نہیں نہیں تم سچ سچ شاعر ہو۔ بھگت رام۔ تم وہ شاعر ہو جو ہر صدی میں۔ ہر برس میں۔ ہر جگہ ہر گاؤں میں پیدا ہوتا ہے لیکن لوگ اچھے لوگ، نیک لوگ بڑے لوگ اسے سمجھنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ تم وہ شاعر ہو دوست، آؤ، ہاتھ ملاؤ۔ !

لیکن بھگت رام اب مجھ سے ہاتھ نہیں ملا سکتا۔ کیونکہ وہ مر رہے ہو چکا ہے۔ سن ۱۹۲۲ء کی طغیانی میں بھیر کے بچوں کو بچاتے ہوئے مر گیا تھا۔ اور وہیں ندی کے کنارے اس کی چتا جلائی گئی تھی۔ اور کوئی اس کی موت پر رویا نہ تھا۔ اور اس کی چتا سے شعلے بلند ہو کر آسمان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لال لال شعلے، شعلوں کے تپے شعلوں کی کلیاں شعلیوں کے پھول اس کی چتا



سے کھل رہے تھے۔ اور چٹا جل رہی تھی اور کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے۔ اور قدرت بھی ادا اس نہ تھی۔ آسمان صاف تھا۔ نیلا گہرا، خوب صورت دھوپ تھی۔ صاف تھی۔ کھلی ہوئی چمکدار۔ نرم اور گرم اور کہیں کہیں بادلوں کے سپید سپید سبک اندام، راج ہنس تیر رہے تھے۔ اور ندی کا پانی گیت گاتا ہوا۔ سجنور بناتا ہوا، لہروں کے جال تنتا ہوا اس کی چٹا کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اور چٹا کے پاس ہی کھٹے اناروں کے جھنڈ میں شعلہ بداماں پھول دمک رہے۔ کائنات خوش تھی۔ خدا خوش تھا۔ خود شاعر خوش تھا۔ کیونکہ آج اس کا دل شعلہ بن گیا تھا۔ اور اس کی روح پھول۔ یہ شعلے جو ہمارے دل میں ہیں۔ یہ پھول جو ہر جگہ ہیں۔ جو ہمارے اندر ہیں اور میرے اندر ہیں اور پھر اندر، اور باہر، سب جگہ، ہر جگہ اور کائنات اور شاعر اور آدمی ایک ہو گئے تھے۔ ایسی موت کے نصیب ہوتی ہے۔ بھگت رام.....



# شمع کے سامنے

میرا گاؤں ابھی دس کو سُو رہا تھا۔ سہ پہر کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔  
خچر کے قدم سُست پڑ گئے تھے۔ اور ڈھلوان پگڈنڈی کے دورویہ سنبھلو  
بنا تھا اور جھیکڑ کی جھاڑیوں میں بیڑوں بنیوں اور رت چڑیوں نے سرکنا  
پھدکنا اور شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ کہیں کہیں کوئی جھینگر خوش الحانی  
سے پکارا اٹھتا اور پھر ایک دم چپ ہو جاتا۔ شاید اس نے بھی سہ پہر کی گھٹتی  
ہوئی دھوپ اور مٹتی ہوئی حدت میں شام کے سہانے خنک آمیز معطر  
سانس کو چھو لیا تھا۔ اور اسی لئے بقراب ہو کر چیخ رہا تھا۔ پھر کیا چپ  
ہو جاتا۔ جیسے اسے ابھی شام کی آمد کا یقین نہیں ہے۔ ابھی نہیں، ابھی نہیں  
شاید شام ابھی نہیں آئے گی۔ پھر کہیں سے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا اس کے  
قریب سے گزر جاتا اور اپنے محبوب کی آمد کا یقین ہو جاتا اور وہ جھارسی  
کی مہنی سے لگا ہوا دیں مسرت سے چیخ اٹھتا۔ آئے گی۔ شام ضرور آئیگی۔  
اسی آس پاس کے درمیان کہیں خوشی کی منزل ہے۔ لیکن



میرا گاؤں تو ابھی دس کوس دور تھا۔ اور میرا خچر تھاک چکا تھا اور بھوک سے  
 بنیاب ہو کر بار بار کان ہلاتا، رک جاتا، نتھنہ پھٹ پھٹاتا اور ادھر ادھر  
 دیکھنے لگتا۔ شاید کہیں منزل کا سراغ ملے ابری کی پیہم ضربوں نے آخر کار  
 اسے اس مقام پر پہنچا دیا کہ جہاں وہ ڈھلوان پگڑی ختم ہوتی تھی اور نیچے  
 پہاڑی پر چڑھ کے نائرا شیدہ کندوں کا بنا ہوا پل تھا۔ نئے نئے کندوں  
 کا بنا ہوا پل تھا۔ نئے نئے کندوں سے جگن کی ہنک آرہی تھی۔ یہاں پہنچ کر میرا  
 خچر کھرا ہو گیا اور ہزار کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ ناچار میں اتر پڑا  
 اور نگام ہاتھ میں لے کر اسے پیچر کی باؤلی کی طرف کھینچ کر لے گیا۔ جو پہاڑی کسی  
 کے بالکل کنارے پر بیٹھ بیٹھی تھی۔ اور روایت کے مطابق آج سے ہزاروں برس  
 پہلے پانڈوں نے بنائی تھی۔ یہاں پر خوبانی کے درخت تھے۔ اور ایک چھوٹی  
 پھگواڑی، میں نے پھگواڑی سے خچر کو باندھا اور رات ب نکال کر اس کے سامنے  
 رکھا پھر جھولے میں سے اپنے لئے مکی کی روٹی اور گینار کا ساگ نکالا۔ کاش، اس  
 وقت کہیں سے ایک سبز مرج مل جاتی اور تھوڑی سی چینی.....

دو ایک مرتبہ پہلے بھی میں اپنے کام کے سلسلہ میں اس راستہ سے گزر  
 چکا تھا۔ باؤلی سے چند قدم کے فاصلے پر دھان کے کھیتوں کا ایک وسیع و  
 عریض سلسلہ تھا اور جہاں یہ کھیت ختم ہوتے تھے۔ وہاں سے چمن کوٹ کی بستی  
 شروع ہوتی تھی۔ چمن کوٹ کے گاؤں میرا ماموں اللہ داد خاں رہتا تھا۔ اور  
 سارے علاقے میں اپنی ڈکیتی کے لئے بہت مشہور تھا۔ بخلاف اس کے میرا باپ  
 سرکاری ملازم تھا۔ اور یوں بھی ہمارے رنگ پور کے گاؤں والے بہت ہی امن



پسند واقع ہوئے ہیں۔ اس نے اپنی قرابت داری کے باوجود میں نے کبھی جن کوٹ میں اپنے ماموں کے ہاں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت بھی جبکہ دن تیزی سے ڈھل رہا تھا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ جس طرح بھی ہو یہ سفر طے کر کے رنگ پور پہنچ جاؤں۔ میرے پاس اپنے بھاری بھر کم بٹوے میں سرکاری لگان کی ایک اچھی خاصی رقم تھی اور گوالڈا دودھ میرا ماموں تھا اور دونا لی میرے پاس تھی۔ اور مٹی میں کارٹوس بھرے ہوئے تھے۔ اور میرا نشانہ دو در دو رنگ ضرب المثل تھا۔ پھر بھی رات بسر کرنے کے لئے میری دورانہ لشی صلاح نہ دیتی تھی۔ ذرا خچر سستا لے تو پھر جیسا بھی ہو میں اسے گھسیٹ لے چلوں گا کھانا کھا کر میں نے خچر کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی اپنا رانتب ختم کر لیا تھا۔ میں نے اسے پھگواڑی سے کھول کر اس کی ایال پر رکھ دی اور اسے باؤلی کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔

پھر میں گھٹنے ٹیک کر باؤلی پر جھک گیا۔ اور میرے ہونٹ باؤلی کے پانی سے ہم سطح ہو گئے۔ مجھے اس طرح پانی پینے میں بہت مزا آتا ہے۔ یہ لطف ادک میں نہیں ہے۔ خچر بھی میرے قریب ہی پانی پی رہا تھا۔ یکا یک وہ اپنی تھو تھنی بڑھا کر بالکل قریب لے آیا۔ حتیٰ کہ میں اس کی گرم سانس کو جس میں گھاس اور چنوں کی ملی جلی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اپنے رخساروں پر محسوس کرنے لگا۔ میں نے آہستہ سے اس کی تھو تھنی کو پر سے کر دیا۔

”آخر یہ کونسا طریقہ ہے محبت کرنے کا۔“

”یہ باؤلی جانوروں کے لئے نہیں ہے۔“



عقب سے کسی نے کہا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو عورتیں گھڑے لئے  
 کھڑی تھیں۔ دونوں میں سے کسی نے کہا ہوگا۔ دونوں جوان تھیں۔ دونوں حسین  
 دونوں متبسم، دونوں کی رنگت زیتونی تھی۔ آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی  
 ہاں ایک کی ٹھوڑی خمیدہ تھی۔ دوسری کی گول اور ملائم، ناشپاتی کی طرح  
 دونوں پیروں سے خنکی تھیں۔ انہوں نے سیاہ گھگھریاں پہن رکھی تھیں۔  
 اور گھگھریوں کے اوپر سیاہ رنگ کی قمیض تھی۔ ہاتھ پاؤں محنت و مشقت  
 کے سخت عادی معلوم ہوتے تھے۔ کلائی سے لیکر انگلی کی آخری پور تک اور  
 ٹخنوں سے لے کر پاؤں کے ناخن تک جلد کی رنگت زیتونی نہ تھی۔ بھوری  
 تھی کبھی زیتونی ہوگی۔ کبھی بھوری بھی نہ رہے گی۔ جب جوانی گزر جائے گی۔  
 تو ہاتھ پاؤں دونوں ہی سیاہی مایل ہوں گے۔ اور ناشپاتی کی طرح پکی  
 ہوئی زیتونی جلد میں وقت اپنے تیز چاقو سے شکاف پیدا کرے گا۔ اور  
 جھریاں تعمیر کرتا جائے گا۔ اور رخساروں کا سونا بھی اڑ جائے گا۔ اور —  
 مگر اندھے فیلسفوف۔ اس وقت تو دیکھو۔ آنکھوں میں جوانی ناچ رہی  
 ہے۔ تبسم زیر لب کانپ جاتے ہیں۔ رخساروں کے سید چمک رہے ہیں جیسے  
 شفق کی ڈالیاں جھک گئی ہیں۔ اور غربی آسمان کے باغ کی رعنائی بہار  
 ان دو مجسموں میں اتر آئی ہے۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ ان  
 میں سے ایک وہ جس کی ٹھوڑی خمیدہ تھی۔

”یہ باؤنی جانوروں کے لئے نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہر انسان جانور ہوتا ہے۔ جو پانی پیتا ہے۔ وہ جانور



ہے کیا آدمی۔ کیا خچر، پیو بیٹیا۔! یہ کہہ کر میں اپنے خچر کو جو میری طرح حیرت سے ان دو عورتوں کو تنک رہا تھا۔ (ہا۔! اس ملک میں بیچارا خچر بھی جنسی بھوک سے مبرا نہیں) تھو تھنی سے پکڑ کر پھر زبردستی پانی پلانے لگا۔

خمیدہ ٹھوڑی والی کی نگاہیں آتش بار ہو گئیں۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی اور اس نے اس پکڑ کر خچر کو اپنی طرف کھینچا۔ خچر اچھل کر واپس پھگوڑی کے پاس جا رہا۔ اسی اچھل کود میں اس نے دو لٹی جو جھاڑی تو شعلا سا ماں حسینہ کا گھڑا چور چور ہو گیا۔

میں ہنسنے لگا۔ دوسری عورت جسے اس کی ٹھوڑی کی مناسبت سے ناشپاتی کہنا چاہیے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ مرجانا۔؟ پہلی عورت نے غصہ سے کہا۔ اور جھٹ مرجانا کے ہاتھ سے گھڑا لے کر ندی میں پھینک دیا۔ لہروں کے زیر و بم میں گھڑا بہت سا فاصلہ صبح سلامت لے کر گیا۔ ہم مہوت کھڑے اس کا سفر دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک بڑی لہر نے اسے ایک اونچی چٹان کے کنارے سے ٹکرا دیا۔ اور ایک پھنکا کے ساتھ لے چارہ وہ بھی.....

"ہائے..... ہائے....." میں دھم دھم ہوتے ہوئے کہا۔

"کیوں ہنستے ہو۔؟" پہلی عورت دانت پیس کر بولی۔

میں نے کہا۔ "جب دو جانور لڑتے ہیں تو گھڑے ٹوٹ جاتے ہیں۔"

وہ بولی۔ "جانور نم ہو، سور۔۔۔ ایک تو باؤلی خراب کر دی خچر کو

پانی پلا کر، پھر سارے گھڑے....! اور اب باتیں بناتے ہو۔ پیسے نکالو نہیں تو۔"

"نہیں تو کیا ہوگا۔؟" میں نے پوچھا۔



”میں تمہارا خچر لے جاؤں گی۔“ یہ کہہ کر وہ خچر کی طرف لپکی اور پیشتر

اس کے کہ میں اسے روک سکوں، وہ اس کی پیٹھ پر چڑھ کر بھاگ گئی۔ مرجانہ  
خچر کے ساتھ دوڑنے لگی۔ اور میں دونوں کے پیچھے بندوق اٹھائے۔ جی میں آیا  
کہ فائبر کر دوں۔ اس قدر آسا تھا مجھے، مگر کیا کرتا عورت ذات پر ہاتھ کیسے  
اٹھاتا۔

”اے، سنو تو۔۔۔۔۔ سنو تو۔۔۔۔۔ خدا کی قسم۔۔۔۔۔ یہ

لو پیسے ٹھہرتو جاؤ۔ خدا کی قسم، مجھے آج رنگ پور جانا ہے۔“

مگر حرامزادی نے نہ سنا، خچر بھی جو پیلے ایک، قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ اب

گھائی پر لڑھکتے ہوئے خچر کی طرح تیزی سے جا رہا تھا۔ مرجانہ ہرنی کی طرح سبک  
گام تھی۔ دوسری عورت مڑ مڑ کر میری طرف دیکھتی جاتی اور سنسنی جاتی۔ ”ٹھہرتو سہی،

سور کی بھی، آج ہی رات تجھ سے بیاہ نہ کیا تو شاہ زمان نام نہیں۔“ میں جھارپوں

پر سے کودتا۔ پھلانگتا، ندی کے کنارے کنارے بھاگا جا رہا تھا۔ اگر دونالی اور

کارنوسوں کا بوجھ نہ ہوتا تو کب کا انہیں جا لیا ہوتا۔ آخر دوڑتے دوڑتے میرا دم

پھول گیا۔ میں رک گیا۔ اور چلا کر کہنے لگا۔۔۔۔۔ ٹھہر جا۔۔۔۔۔ اے ادا کو

کی بیٹی۔۔۔۔۔ رہن خچر! ورنہ ابھی فائر کرتا ہوں، مگر کینٹ نے یہ دھمکی سنکر

مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ وہ اسی طرح خچر کو ایڑ لگاتی دوڑاتی چلی گئی۔۔۔۔۔ دوڑاتی چلی

گئی اور بھگاتی چلی گئی۔ اور نقش پاکو مٹاتی چلی گئی۔ اور میں وہیں ایک ٹیلے پر کھڑا

ہو کر اچھے دیکھتا رہا۔ وہ گھائی کے نیچے جا رہی تھی۔ جہاں ندی ایک چھوٹی سی وادی

میں بہتی تھی۔ جہاں ایک چھوٹا سا مرغزار تھا۔ اور سہرتے پر تین چار جیمے کھڑے تھے۔



یہ خیمے تو خانہ بدوشوں کے سوا اور کسی کے نہیں ہو سکتے ان میں آگ روشن تھی! اور  
 ہلکا ہلکا لطیف سا دھواں سبز تلے کی سطح سے اٹھتا ہوا آسمان کی طرف جا رہا  
 تھا۔ جہاں پر بادلوں کا رنگ گلابی سے عنابی اور عنابی سے شہابی ہو چکا تھا۔ اور  
 تاروں کے کنول کھلتے جا رہے تھے۔ — مر جانہ اور خچر پر مہم بھی ہوئی عورت کو  
 میں نے ان خیموں کے پاس اترتے دیکھا اور پھر وہ دونوں ایک خیمے میں گھس گئیں۔  
 خچر باہر چرنے لگا تبھوڑی دیر میں ایک آدمی خیمے سے باہر نکلا، اس نے اپنے ہاتھ  
 اپنی کنپٹیوں کے پاس لے جا کر وہیں دور سے میری طرف دیکھا اور پھر خچر کو ایک  
 خیمے سے باندھ کر اندر چلا گیا۔ میں نے سوچا، لو اب ان خانہ بدوشوں سے الجھنا  
 پڑ گیا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ اپنے ماموں اللہ داد خاں سے انداد طلب کروں۔ پھر  
 سوچا میرے بھوے میں سرکاری لگان کے پیسے ہیں کہیں اسے تپہ چل گیا تو وہ ڈاکو  
 تو ہے ہی کہیں مجھ پر ہی ہاتھ صاف نہ کرے اب تو اکیلے ہی ان خانہ بدوشوں سے  
 نپٹنا پڑے گا۔ خیر یہ دونالی انہیں ڈرانے کے لئے کافی ہو گی۔ یہ سوچ کر میں نیچے اترنے لگا۔  
 جلدی جلدی، کیونکہ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ شفق کے گم ہوتے ہی تاریکی گویا پیاروں  
 کی چوٹیوں سے ابل پڑی اور ساری وادی میں پھیلتی چلی گئی۔ جب میں مرغزار میں  
 پہنچا تو چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ ہاں خیموں میں آگ روشن تھی۔ اور پرے  
 ایک درخت سے بندھا ہوا پیرا خچر کھڑا تھا۔ میری طرف کس بلکیسی سے دیکھ رہا تھا۔  
 گجراؤ نہیں میرے محبوب، میں تجھے ان ظالموں کے جینگل سے آزاد کرنا ہوں۔  
 میں آگے بڑھا۔ کسی نے پکارا۔

”کیون ہے؟“



"میں ہوں ایک آدمی۔"

"آدمی کہ جانور۔" وہ کمبخت پھر بول پڑی۔ اب دونوں ہاتھ کو لہوں پر رکھے بڑے ٹھٹھے سے کھڑی تھی۔ اور تھیکے کا پر وہ ہوا میں ہل رہا تھا۔ اور شعلوں کی لپک اس کے رخساروں پر ناچ رہی تھی۔

"شمع تم اندر چلو۔" اس آدمی نے کہا۔

"میں اس سے خود نیٹ لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں لڑائی جھگڑا کرنے نہیں آیا۔ تمہاری بیوی میرا خچر چرا لائی ہے۔ وہ مجھے دیدو۔"

وہ بولا۔ "میری بہن کو میری بیوی نہ کہو راہی۔!"

میں نے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی ہے تمہاری بہن یا بیوی یا ماں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ مجھے اپنا خچر چاہیے۔"

"میں تمہاری ماں ہوں سوری کے جنے۔!" وہ پھر چیخی اور خیمے کے باہر آن کر کھڑی ہو گئی۔

"تم چپ رہو شمع، مجھے اس اجنبی سے بات کرنے دو۔"

وہ اندر چلی گئی۔ آدمی کہنے لگا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو۔؟"

"رنگ پور۔"

"تمہارا نام۔؟"

"مشاہ زماں۔"



"کیا کرتے ہو۔؟"

"میں ————— ؛ میں نمبردار کا بیٹا ہوں۔"

"میں پوچھتا ہوں تم کیا کرتے ہو۔ تم کہتے ہو میں نمبردار کا بیٹا ہوں۔"  
میں نے کہا۔ "میں ————— شکار کھیلتا ہوں، عشق کرتا ہوں کبھی کبھی  
اپنے باپ کے لئے دیہات سے لگان وصول کرتا ہوں۔" اچھالا دارب میرا خچر۔  
..... یہ کہہ کر اپنے خچر کی طرف بڑھا۔

وہ بولا۔ "ہم دو تین دن میں زنگپور آنے والے ہیں۔ وہاں کھیتیوں  
میں کام ملے گا۔"

"میں نے کہا۔" تم خانہ بدوش بڑے کام چور ہوتے ہو۔ کام سے جی چراتے ہو  
دن بھر آوارہ گردی کرتے رہتے ہو۔ یا کسانوں کی بھیڑ بکریاں چراتے رہتے ہو اور  
جب گناؤں سے چلے جاتے ہو تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کسان کے ہاں سے مل چور کیا گیا  
فلاں کے گھر سے مرغیاں غائب ہیں۔ اس کی بکری نہیں ملتی اور اس کا گدھا۔"  
وہ بولا۔ "یہ تو معمولی سی بات ہے، تم لوگ زمین کے بادشاہ ہو۔ ان  
چھوٹی چھوٹی باتوں پر تمہارا دھیان نہ جائے تو اچھا ہے۔" اس کے لہجہ میں بھی  
لحاجت تھی۔

"ہمیں کام کی بڑی ضرورت ہے۔"

"چمن کوٹ نہیں پسند نہیں۔؟"

"جگہ اچھی ہے مگر ڈاکوؤں کی بستی ہے۔ اور اللہ داد ہمیں بہت ڈراتا  
دھمکتا ہے۔ اگر یہاں رہے تو کسی دن خون خرابہ ہو جائے گا۔" یکایک اس نے



اپنا ہاتھ بڑھایا میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں ایک بندوق ہے۔  
 وہ بولا۔ "تم اپنا چہرے جاؤ میری بہن تو بیوقوف ہے بھلا راہیوں  
 سے کون الجھتا ہے۔ وہ بھی تو ہماری طرح خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ گو وقتاً طور پر  
 ہی ہسی۔"

وہ ہنسنا اس کی ہنسی بڑی دلکش تھی۔

قریب کے ایک خیمے کے اندر ایک بڑھیا، ایک جوان عورت دو بچوں  
 اور ایک ادھیر عمر کے خانہ بدوش کو دیکھ سکتا تھا۔ سب لوگ کھانا کھا رہے تھے۔  
 بڑھیا بار بار ہانڈی میں لکڑی کا چھچھہ ڈال کر شور بہ نکالتی اور سب کو تقسیم  
 کرتی جاتی تھی خوشبو اڑا کر نتھنوں میں آ رہی تھی۔

اس کی نگاہ نے میری نگاہ کا تعاقب کیا۔ پھر میری طبیعت کا اندازہ  
 کر کے بولا۔

"تو آؤ، آج رات یہیں رہو۔ آگے خطرناک جنگل بھی ہے۔ اکیلے کیسے  
 جاؤ گے؟"

"اکیلا تو نہیں ہوں۔ یہ دونالی میرے ساتھ ہے۔" میں نے کہا۔  
 "اس دونالی پر تمہیں برا گھمنڈ ہے۔ اسے چلا بھی لیتے ہو۔" پھر وہ ہنسنا۔  
 اس کی ہنسی بڑی دلکش تھی۔ میں نے اس کے لہجہ کی طنز کو معاف کر دیا۔ اور  
 چپ چاپ اس کے خیمے میں داخل ہو گیا۔

چوہا زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس پر ہانڈی ابل رہی تھی۔ مرجانہ  
 پاس بیٹھی چھچھہ پھیر رہی تھی۔ اور آٹھ مدھم کرتی جاتی تھی۔ شمع سر جھکائے مکی کا



آٹا گوندھ رہی تھی۔ روشنی اس کے رخسار پر اس کے بالوں پر پڑ رہی تھی۔ مرجانہ کی آنکھیں حیران تھیں تو شمع کی محجوب دھیال فرش پر بچھا ہوا تھا جس سے پرانے دھان کی بو آتی تھی۔ یہ خیمہ جو گندے چیتھڑوں۔ رنگارنگ کپڑوں کے ٹکڑوں اور گندم کے خوشوں سے بنا ہوا تھا۔ دیکھنے میں سبک لیکن بڑا مضبوط تھا۔ تانت کی سلائی تھی۔ ایک کونے میں دو گٹھریاں تھیں۔ ایک بکری بندھی تھی جس کے تھنوں پر ایک میلا سا کپڑا لٹھا ہوا تھا۔ ایک کھردرے بالوں والا کتا مجھے اندر آتا دیکھ کر غرائے لگا۔ ”چپ بے ظالم۔“ مرد کی آواز نے اسے خاموش کر دیا۔ اس کتے کے بالوں کا رنگ فولادی تھا۔ اور آنکھیں سرخ۔ اچھا نام پایا تھا۔ ”ظالم۔“

میں نے اس آدمی سے کہا۔

”اور تمہارا نام کیا ہے؟“

”وہ بولا۔“ مجھے خدا داد کہتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تم اپنی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتے۔ جب تک یہ اپنے خاوند سے بچے گی نہیں درست نہیں ہوگی۔“

وہ ہنسنے لگا۔ کوئی ایسا خاوند بھی تو بچے جو اسے درست کر سکے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بیاہ دو اس سوری کو۔ مار مار کر کھال نہ ادھیڑ دوں تو

شاہ زماں۔۔۔۔۔!“

شمع بجلی کی طرح پک کر اٹھی اور اپنے بھائی سے بندوق چپین کر بولی۔

”ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔ راہی ہو۔ اس لئے جان بخشی ہوں کوئی دوسرا ہوتا تو

جیڑا اس کے کلیجے سے پار ہوتا۔“



خدا داد مسکرا کر کہنے لگا۔ "شمع سچ کہتی ہے۔ اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں

ہوتا۔"

"اس کے تو ہم بھی قایل ہیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ اور وہ تیزی سے مڑ گئی۔ اور مرجانہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ مرجانہ کی بڑی بڑی حیران نگاہیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ شمع اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ وہ پھر لکڑی کے پرات کے پاس بیٹھ گئی اور نکلی کما آگوندھ کر ٹوڑھے پکانے لگی۔ نرم نرم گرم گرم ٹوڑھے جو چولہے میں سینکے جا رہے تھے۔ اور جن سے تازہ مکی کے سبھوں کی خوشبو آتی تھی۔ سامنے کے خیمے میں ایک لڑکا رو رہا تھا۔ اور اس کی ماں اسے گایاں دے رہی تھی۔ اور اس کا باپ پاؤں چرخی چلا کر چھماق پر اون کترنے کی قینچی تیز کر رہا تھا۔ "چپ ہو جی شیطان کی اولاد۔ ہمیں تو یہی قینچی تیرے سینے میں بھونک دوں گا۔"

لڑکے نے روتے روتے کہا: "شیطان کی اولاد تو ہے ابا۔"

باپ مسکرائے لگا۔ اور اپنے انگوٹھے پر پھل کی دھار کا اندازہ کرنے لگا۔ پھر اس نے فردر سے چرخی گھمائی اور قینچی کے ایک پھل کو حتماق پر رکھ دیا۔ شراروں کی ایک پھل جھڑی سی تاریکی میں چھوٹی گئی۔

"خدا داد۔!"

"کون ہے — راول۔؟"

"ہاں۔"

"کیا کہتے ہو راول۔؟"

"بھئی۔ آج خیمے سے باہر نہیں آؤ گے۔ ایسی عمدہ چاندنی کھلی ہے۔!"



ہم لوگ خیمے کا پردہ بند کئے رسی بٹا رہے تھے۔ میں اور مرجانہ سن کے خوفناک  
کوتر کر کے رسی میں لگاتے جاتے تھے۔ شمع نے رسی کے ایک سرے کو اپنے پاؤں کے انگوٹھے  
سے دبا رکھا تھا۔ دوسری طرف سے خدا داد بٹتا جاتا تھا۔ لیکن کیا مجال جو شمع کے پاؤں  
میں ذرا بھی لغزش پیدا ہو جائے۔ ہاں اس کے رخساروں کا رنگ گہرا سرخ ہو گیا تھا۔  
اور پلکیں بوجھل ہو کر گری پڑتی تھیں۔ وہ انہیں بار بار سنبھالتی لیکن اب نظر نہ ملا سکتی تھی۔  
ستواں ناک کے نیچے غنچہ دہن نیم دانتھا۔ اور اس کا سانس تیز تھا۔ اور وہ کبھی کبھی اپنی  
پتلی سی سرخ زبان نکال کر اپنے لبوں پر کھیر لیتی اس کی یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔  
راول کے بلانے پر خدا داد اٹھا اور خیمے کا پردہ کھول کر باہر کھڑا ہو گیا۔ پھر  
اس نے ایک زور کا سانس لیا جیسے کھلی ہوئی چاندنی کو سونگھ رہا ہو۔ شمع اس طرح بیٹھی  
تھی کہ جب خیمے کا پردہ ہٹا تو چاندنی کا طوفان یکلخت اس کے رخ سے ٹکرایا اور  
پھر وہاں سے اچھلتا ہوا دھچال کے خوشوں پر سے پھلتا ہوا خیمے کے دوسرے کونے تک  
چلا گیا۔ یہاں وہ بکری بندھی تھی۔ شمع کا زنیوئی حسن شفاف مرمبیں مبدل ہو گیا۔ اس کی  
آنکھیں جھپک گئیں۔ اور مجھے گویا اس کی بند پلکیوں کے اندر سیاہ تیلیوں میں چاندنی کی  
شعاعیں کانپتی ہوئی نظر آئیں۔ چاندنی، جوانی اور کچھ شاید نگاہوں کی فتنہ سامانی تھی۔  
کہ مجھے اس وقت شمع کے چہرے پر ایک بلوریں کیفیت کی تابانی نظر آئی۔ دوسرے  
لحے میں خدا داد کی آواز نے یہ احساس زایل کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "شاہ زمان —  
چلو — باہر آ جاؤ — شمع — مرجانہ —"

شمع اپنے بھائی کی توڑے دار بندوق اور میری ٹوایلو پوراٹھائے ہوئے  
باہر نکلی۔ میں نے پوچھا تو بولی۔ "تیرے گھمنڈ کا امتحان لینا چاہتی ہوں۔"



باہر راول کھڑا تھا۔ چھ فٹ ننگے پاؤں، گھیرا شلوار جو صرف گھٹنوں تک  
آتی تھی گھٹنوں کے نیچے مانگیں بالکل سنگی تھیں۔ اور ان پر زخموں کے نشان تھے۔ لمبے  
لمبے بال سر پر رکھ چھوڑے تھے۔ اور ان پر اس نے بغدادی چور کی طرح ایک رومال باندھ  
رکھا تھا۔ دائیں کان میں ایک لوبہ کی بالی تھی۔ خانہ بدوش نہیں کسی فلم کا ہیرو معلوم  
ہو رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا بھر اس کی نگاہیں شمع کے چہرے پر گر گئیں۔  
راول بولا۔ "خدا داد کہتا ہے تمہارے پاس انگریزی بندوق ہے۔"  
"ہاں، یہ دیکھو، راہی کی بندوق۔" شمع چمکی۔

راول اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ "یہ کیسی بندوق ہے۔ اس کی ایک  
نالی میں زندانے ہیں۔ دوسری نالی یا کل صاف ہے۔ ہماری نوٹری دار بندوق کی طرح۔"  
میں نے کہا: "دندانے دار نال میں بڑے شکار کے لئے گولی ڈالتا ہوں اور  
سیدھی نال سے نیز کا شکار کرتا ہوں یہ۔۔۔۔۔ گولی والا کارنوس ہے۔۔۔۔۔ چھپرے  
دار۔۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ ہے۔۔۔۔۔"

راول پور۔ "انگریزی رائفل اچھی ہوتی ہے مگر ہماری توڑے دار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

شمع بولی۔ "بندوق اچھی یا بری نہیں ہوتی یہ تو جوان کا ہاتھ ہوتا ہے۔"  
راول منے لگا۔ مجھے اس کی منہسی مسکرای کی طرح معلوم ہوئی۔ میں نے کہا۔  
"جوان کے ہاتھ بھی دیکھ لو۔ کون منع کرتا ہے۔"

راول آگے بڑھا۔ خدا داد کا چہرہ بالکل سنجیدہ تھا۔ راول میرے قریب آ رہا تھا۔ خدا داد نے آہستہ سے کہا: "شاہ زماں ہمارا مہمان ہے۔"



راول رکا۔ پھر چھپے پھٹ گیا۔

خدا وادنے کہا۔ ”وہ سامنے دیکھو۔ دیوار کی بمبل۔ وہ ہمارا نشانہ ہے۔“  
چاندنی رات میں دیوار کی وہ بمبل، ایک صلیب کی طرح آسمان کی طرف اٹھتی  
ہوئی نظر آرہی تھی۔

شمع نے بندوق میرے ہاتھ میں تھما دی اور کہا۔ ”تم ہمارے مہمان ہو، پہلے  
تمہارا حق ہے۔“

اس کے لہجہ کی خفت طنز سے میں جھٹلا گیا۔ میں نے شست باندھ کر بندوق چلائی  
مگر میں جانتا تھا کہ میں چوک جاؤں گا۔ وہ بمبل وہیں کھڑی تھی۔

خدا واد نے اپنی نگاہوں سے ایک بار اس بمبل کا جائزہ لیا اور پھر بندوق  
سیدھی کر کے لبلبی دبا لی تھیں۔

مگر بمبل وہیں کھڑی تھی۔ راول ہنسنے لگا۔

اب راول نے ایک عجیب بے اعتنائی سے اپنی بندوق ہاتھ میں لی اور اس  
طرح بندوق چلائی کہ سامنے دیوار کی بمبل تو کیا اگر غصہ کا پم ہوتا تو وہ بھی جھجھکتا۔  
لیکن بمبل وہیں کھڑی تھی۔ ایک صلیب کی طرح آسمان کی طرف اٹھی ہوئی۔  
شمع نے جھٹلا کر بندوق راول کے ہاتھ سے چھین لی اور بولی۔ ”آج تمہیں ہوا  
کیا ہے۔“ اور یہ کہہ کر اس نے نالی میں توڑا ڈال کر بھرا اور پھر ٹھائیں۔

بمبل غائب تھی۔ شمع نے بندوق کا دہانہ اپنے ہونٹوں سے لگا کر کھینچا اور  
پھر بندوق کو راول کے ہاتھ میں دیدیا۔ راول کے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے شمع کی انگلیوں  
پر سختی سے جم گئے پھر شمع نے فوراً ہاتھ چھڑا لیا۔ بندوق زمین پر جا گری۔ راول ہنس کر



مجھ سے کہنے لگا۔ "بہنی پکڑتے ہو جوان۔"

"کیوں نہیں۔ لاؤ ہاتھ۔"

پھر ہم بہنی پکڑنے لگے۔ یہ خانہ بدوش نہیں جانتے تھے کہ میں بہنی پکڑنے میں کس قدر مشاق ہوں۔ بہت جلد میں نے خدا واد کو مات دیدی پھر راول سے قوت آزمائی ہوئی۔ بہنی چھڑاتے ہوئے میں نے اسے وہ جھٹکا دیا کہ وہ دس گز پرے جاگرا اور مرجانہ تالی بجا کر سنسنے لگی۔ شمع نے غصہ میں آکر مرجانہ کے پھڑمارا اور وہ رونے لگی۔

میں نے شمع سے کہا۔ "مرجانہ نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔"

وہ بولی۔ "تم چپ رہو جی بڑے مرجانہ کے حمایتی بن کے آئے ہیں۔ ایک رات کا مہمان اور ابھی سے کیسی باتیں کرتا ہے۔ جیسے خانہ بدوشوں کا یہی سردار ہے ایک راول سے بہنی کیا چھڑائی آفت آگئی۔"

خدا واد سننے لگا۔ اتنے میں سامنے کے خیمے میں جو خانہ بدوش قنچی تیز کر رہا تھا۔ اس نے چرخی اور حتماق اٹھا کر الگ رکھ دیئے اور دف بجا کر گانے لگا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی اس کے ساتھ مل کر گانے لگے۔ ہم سب لوگ وہیں چلے گئے۔ راول کے خیمے کے لوگ بھی اٹھ کر وہاں چلے آئے۔ اور جو تھے خیمے کے افراد بھی تھے۔ — الاؤ میں دو بڑے بڑے سوکھے ٹدھ جل رہے تھے۔ اور ان کی خوشگوار آگ کا پرتو ہر چیز پر تھا۔ اور پس منظر میں بکری کا رباب بج رہا تھا۔ ہلکا، مدھم، شیریں اور خانہ بدوشوں کی آوازیں چاندنی رات میں گھلتی ہوئی۔ گونجتی ہوئی سلسلہ کوہ تک پھیلتی جا رہی تھیں۔ ایک چاندنی کا طوفان تھا۔ ایک نشے کا طوفان تھا۔ اور تاروں کی ایک سبک اندام سندر کشتی جھل جھل مل کرتی ہوئی تیر رہی تھی۔ اور اب شمع کے پاؤں ناچ رہے تھے۔ اور



اس کا جسم اس کی روح میں گچھل گیا تھا۔ اور اب وہ ہمارے حلقے میں ہمارے حلقے سے باہر۔ یہاں وہاں زمین پر آسمان پر ہر جگہ معلوم ہوتی تھی۔ اسکی آواز زمین کی آواز تھی۔ ازلی وحشی، ناقابل تسخیر۔ اس کا رقص۔ کائنات۔ مسلسل پیہم، مضطرب۔ غیر مختتم۔ اس کے بال اڑاڑ کر اس کے رخساروں پر پڑ رہے تھے۔ اور جب رقص کی دوسری گردش میں انہیں جھٹک دیتی تو ایک بجلی سی کوند جاتی۔ تاریکی، بجلی۔ آواز اور گردش جیسے ساتوں آسمانوں کے سورج، چاند اور تارے سنبھل گئے تھے۔ اور ایک ہیوے کی طرح زمین پر ناچ رہے تھے۔ جیسے تخلیق اور قیامت، زندگی اور موت۔ خدا اور انسان ایک ہی سیکر میں ضم ہو کر ہنگامہ آفرینش کی ابتدا کر رہے تھے۔ اور ناچ ناچ کر کہہ رہے تھے۔ دیکھو، دیکھو، یہ ہے وہ عورت، وہ شمع، وہ نور کی مشعل جو اپنے رحم کے مندر میں دیوتاؤں اور انانوں کو پیدا کرتی ہے۔ ان کی تہذیب و تمدن کو بقا دیتی ہے۔ ان کے سینوں میں سرچشمہ علم و اخلاق کو فروزاں کرتی ہے۔ ازل سے اب تک یہ وہی عورت ہے۔ وحشی، شعلہ، طوفان رقصاں حیات کا مرکزی بھنور۔۔۔۔۔ !



ناچ اور نغمے کی یہ محفل شاید صبح تک جاری رہتی اگر میرا ماموں اللہ داد خاں اگر رنگ میں بھنگ نہ کر دیتا۔ یکایک وہ اس محفل میں آکر چھینے لگا۔  
ابے حرام زادو، خازن بد دشو۔ اٹھا دیہاں سے اپنا اڈہ ڈیرا اور کل جاؤ ہمارے گاؤں سے ابھی اس کا دم، ورنہ — شمع ناچتے ناچتے ایک دم بجھ گئی۔ اور ہانپتے



ہوئے وہ اپنے بھائی کی طرف دیکھنے لگی۔ راول اور خداداد دونوں فوراً اللہ داد خان کی طرف بڑھے، لیکن اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہیں کھڑے رہ گئے۔

راول بولا۔ "ہم خانہ بدوش ہیں۔ ہم کسی کی ہیکڑی برداشت نہیں کر سکتے۔ اس آسمان کے نیچے ختنی زمین ہے۔ ہماری ہے۔ ہم۔۔۔۔۔۔ جہاں جی چاہے گا ہمارا وہیں رہیں گے۔ جب جی چاہے گا اٹھ کر چلے جائیں گے۔"

اللہ داد خان پستہ قد گٹھیلے بدن کا ڈاکو تھا چھوٹی چھوٹی مونچھیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں جو اپنے گڑھوں میں فمقوں کی طرح چمکتی تھیں۔ اس کے جتنے سے کسرت اور پھرتی اور چالاکی کا اظہار ہوتا تھا۔ اور بے رحمی کا بھی۔۔۔۔۔۔ پستول اس نے راول کے سینے پر باندھ رکھا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہ رنگ پور کا گاؤں نہیں ہے۔ یہاں مسحڑے نہیں بستے۔ یہ اللہ داد خاں کا گاؤں ہے ایک کھوہ میں دو شیر نہیں رہ سکتے۔ چپ چاپ تے کل چلے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ خیمے تک جلوادوں لگا۔"

میں نے غصہ میں آکر خداداد کو پیچھے دھکیا دیا اور اللہ داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "ماموں ان غریب خانہ بدوشوں سے کیوں لڑتا ہے اگر لڑنا ہے تو میرے ساتھ لڑو۔ رنگ پور والے مسحڑے ہیں تو آ۔ میں مقابلے کے لئے تیار ہوں۔ وہ مجھے دیکھ کر حیران ہو گیا۔

"ارے تو۔۔۔۔۔۔ شاہ زماں۔۔۔۔۔۔ یہاں کیا کر رہا ہے۔"

ان جنگلیوں کے خیمے میں۔ اپنے گھر کیوں نہیں آیا۔؟ پھر شمع اور مرجانہ کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اب یہ خیمے غرور جلانے



پڑینگے بگاؤں کے سارے جوان مرے ان خانہ بدوش عورتوں پر۔  
 راول آگے بڑھا۔ اللہ داد نے لستول تھوڑا سا اور آگے بڑھا دیا۔  
 خدا داد نے راول کو روک دیا۔ پھر نہایت شیریں لہجہ میں بولا۔  
 ”اللہ داد خاں کل شام کو ہم یہاں سے چلے جائیں گے بس اتنی مہلت  
 ہمیں دیدو۔“

”اچھا۔ کل شام کو ضرور چلے جائیو۔ اگر میں نے تمہیں یہاں دیکھا تو گاؤں کے  
 کتوں سے تمہیں پھڑواڈالوں گا۔“ پھر میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔  
 ”گھر چلتے ہو۔؟“

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔  
 ”کہاں سے آرہے ہو۔ لگان وصول کر کے۔؟“ بوا تو آج بہت بھاری ہو گا۔  
 اس کی تیز آنکھیں چمکنے لگیں۔

میں چپ ہو رہا۔ راول اور خدا داد نے میری طرف دیکھا۔ پھر اللہ داد خاں  
 نے ان دونوں کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ یہ شاہ زماں بڑا ہوشیار بونڈل ہے۔  
 اللہ داد نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔ ”اچھا تو میں چلنا ہوں۔ صبح مجھ سے مل کر جاسو یہاں  
 سے.....!“

راول اور خدا داد دونوں اللہ داد خاں کو کسی کے اس پار پہنچانے کیلئے گئے  
 بہت دیر کے بعد لوٹے۔ وہ ابھی ملے نہ تھے کہ میں نے اپنی تجویز پختہ کر لی۔ میں نے اپنا بوا  
 اٹھا کر شمع کے سامنے پھینک دیا اور اس سے کہا۔

”صبح تم سے ملے ہوں گا۔“



وہ بوا دیکھ کر مسکرائی بولی "میں اسے پاس نہیں رکھتی۔ یہ تمہارا مال ہے اس کی حفاظت کرنا تمہارا کام ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہارا مہمان ہوں۔"  
 شمع نے کہا۔ "میں نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔"  
 "ڈرتی ہو۔؟"

اس نے بوا میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ چمک کر بولی۔ "مرد اپنی بندوق اپنے خیمے اور اپنی عورت کی خود حفاظت کرتا ہے۔ لیکن تم مٹی کے گھروں میں رہنے والے، میجرے ان باتوں کو کیا جانو.....؟"

میں نے دونوں اپنے سر ہانے رکھ لی اور دھیال پر دراز ہو گیا۔ "مجھے جاؤ۔"  
 میں نے کہا۔ "مجھے تو نیند آرہی ہے۔" اور یہ کہہ کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔  
 بہت دیر کے بعد رادل اور خدا داد، اللہ داد خان کو سمیٹا کر لوٹے اور دیر تک خیمے کے باہر سرگوشیوں میں باتیں کرتے رہے۔ میں بظاہر سو رہا تھا۔ لیکن دراصل ان کی ہر ایک بات سن رہا تھا۔ میرا ہاتھ اپنی دونوں پر تھا۔ وہ دونوں شمع کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اور شمع کہہ رہی تھی کہ وہ اب کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ قول مار چکی تھی۔ رادل اسے گالیاں دینے لگا۔ اور شمع اسے..... پھر خدا داد نے کہا۔

"کیوں نہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں اور جنگل میں جا کر گاڑ دیں۔"

لیکن شمع نے نہ مانا اس نے کہا۔ "اللہ داد کا کیا بھروسہ وہ کل کو تمہیں بھی بھانسی پر چڑھا دے گا۔ بھلا خانہ بدوش بھی قتل کرتے ہیں کہیں۔؟ چوری، ڈکیتی تو خیر الگ بات ہے لیکن قتل تو خانہ بدوشوں نے آج تک کبھی نہیں کیا۔ پھر کیا اپنے خاندان



کو بٹہ لگاؤ گئے۔ "آخر راول اور خداداد کو شمع کی بات ماننی پڑی۔

خداداد اور شمع نے خیمے میں آکر آگ بجھا دی اور دھیال پر آکر سو رہے اور  
مرجانہ پہلے ہی سے محو خواب تھی۔ شمع بھی اس کے قریب آکر لیٹ گئی۔ خداداد میرے  
قریب آکر لیٹ گیا۔ اب میں شمع اور خداداد کے درمیان سو رہا تھا۔ خیمے کا دروازہ کسی  
نے بند نہ کیا تھا۔ اور پردہ ہوا کے تیز جھونکوں سے پھٹ پھٹا رہا تھا۔ اور چاند کی کرنیں  
دھیال پر سچلیتی ہوئی آ رہی تھیں۔ "ظالم" دروازے پر چوکنہ کھڑا تھا۔ اور تختے  
اونچے کئے فضا میں کسی موہوم دشمن کو سونگھ رہا تھا۔ نحیف سی آہٹ پا کر وہ بھونکنے  
لگتا۔ میں دم سادھے جاگ رہا تھا۔ ایک طرف شمع تھی اور دوسری طرف خداداد  
سو رہا تھا۔ وہ بہت جلد سو گیا اور خراٹے لینے لگا۔ یہ نقلی خراٹے نہ تھے۔ میں نے  
کروٹ بدل کر شمع کی جانب دیکھا۔ چاندی کا ہالہ اس کے رخ پر اور اس کے بل کھائے  
ہوئے بالوں کے گرد تھا۔ اور اس کی خمیدہ ٹھوڑی کے نیچے اس کا بایاں ہاتھ بس  
ہو رہا تھا۔ وہ میرے استغدر قریب ایسی تھی کہ میں ہاتھ پھیلا کر اس کی ٹھوڑی کو چھو  
سکتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی کو چھو لینے، اس کے رخساروں کو چوم لینے اور اس  
کے سارے جسم کو بے کراہی آغوش میں کچل دینے کا طوفانی جذبہ میرے دل میں گونجنے  
لگا۔ میں جسم کی آواز سننا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال  
لیں لیکن یہ گونج تو گویا دل کی ہر دھڑکن اور دوران خون کا توجہ پن گئی تھی۔ جسم  
کے کھڑے نڈے سے ایک ہی آواز آرہی تھی۔ شمع کو کچل ڈالو۔۔۔۔۔ شمع کو کچل  
ڈالو۔۔۔۔۔ میں آہستہ سے اس کے قریب سرک گیا۔ اور پھر مڑ کر خداداد کی طرف  
دیکھنے لگا۔ وہ گھوگہ کار رہا تھا۔ اور خراٹے لے رہا تھا۔ ہلکے ہلکے۔۔۔۔۔ میں نے اپنا



ہاتھ شمع کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں پر رکھ دیا۔ کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی۔ دیر تک میرا جلتا ہوا گرم ہاتھ اس کی خنک برفانی انگلیوں پر پڑا رہا۔ کوئی جنبش پیدا نہ ہوئی پھر آہستہ سے میں نے اس کی خمیدہ ٹھوڑی کو چھوا اور میری رگوں اور نسوں میں لاکھوں شعلے ترپنے لگے۔ اور ہوفانی لہروں کے ریلے اچھل اچھل کر ساحل حیات سے ٹکرانے لگے۔ کانوں میں ایک ہی نغمہ تھا۔ ایک ہی مسلسل گونج تھی۔ شمع کو کچل ڈالو۔ شمع کو کچل ڈالو۔ میں نے ایک نظر پھر خدا داد کی طرف ڈالی۔ پھر مرجانہ کی طرف جو بدستور کروٹ بدل کر سو رہی تھی۔ پھر میں شمع کی جانب اور کھسک گیا۔ دھیال پر ایک ہلکی سی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ یہ سرسراہٹ جو ایک میٹھی سرگوشی تھی۔ ایک نغمہ راز تھی۔ مسرت کی نفرتی لہر تھی۔ اور میں اس کے بہاؤ میں تیرتا ہوا شمع کے بالکل قریب چلا گیا۔ پھر میں نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر انہیں زور سے دبایا جاگ — جاگ — اے — شمع شبستان

وصال !

شمع جاگی نہیں۔ اس کی آنکھیں بدستور بند ہیں لیکن میرے ہاتھ کی انگلیوں نے اس کے ہاتھ کا آہنی لمس اسی طرح محسوس کیا کہ اگر میں مرد نہ ہوتا تو شدت درد سے بلبلا اٹھتا۔ وہ آہستہ آہستہ میری انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ خاموشی سے، ہلے جلے بغیر آنکھیں کھولے بغیر مجھ سے کچھ بات کہے بغیر ہی وہ میرے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک آہنی شکنجے میں کس کر مروڑ رہی تھی۔ اور میں مدافعت کرتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ انگلیوں میں اتنی طاقت اتنی قوت اتنی توانائی کہاں سے آگئی۔

اس پھول کے جسم میں فولاد کی سختی کہاں چھپی ہوئی تھی۔ میں نے ہزار گوشش



کی کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا لوں۔ لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ آخر جب دردِ حد سے بڑھ گیا تو میں دوسری کروٹ بدلنے پر مجبور ہو گیا۔ اب میری پیٹھ اس کی طرف تھئی۔ اور میرا ہاتھ اس کے ہاتھ کی انگلیوں میں جکڑا ہوا تھا۔  
شمع نے سرگوشی میں کہا۔

"بینی بکڑو گئے۔؟"

میں نے کہا۔ "نم عورت نہیں ہو۔ چڑیل ہو۔؟"

وہ آہستہ سے منسی بولی۔ "اور شکجہ۔؟"

میں نے کہا۔ "دیونی کی اولاد ہو۔ سوری۔؟"

اس نے کہا۔ "ماہیا سنو گئے۔؟"

میں نے کہا۔ "میرا ہاتھ چھوڑ دو۔ تمہاری سات پشتوں پر لعنت۔"

وہ بولی۔ "مجھے ماہیا سے عشق ہے۔ جب گھاٹیوں میں اس کی آواز کو بھتی

ہے۔ ماہا ہا۔"

"چپ ہو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "خدا کے لئے۔ اگر کوئی سن لے تو۔"

"میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔۔۔۔۔ اچھا تو ماہیا سنو اور وہ دھیمے

بہت ہی دھیمے سرزوں میں گانے لگی۔ اس کی آواز میں منسی، شور اور شرارت کے مزے

ہوئے تھے۔

بازار بکندی پٹی — بازار بکندی پٹی

نڈھی مار گئی پلیٹی

نڈھا کمزور دے جی دے جانی۔ پہاڑ دگھیلے آدیں



## تہساری مہربانی

"حرامزادی! میں نے غصہ سے کہا، اور اس نے اس پر میرے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک اور بل دیا کہنے لگی۔

"شمع خانہ بدوش کی لڑکی ہے۔ وہ کسی مٹی کے گھر میں رہنے والے کسان کی لڑکی نہیں ہے جو نمبردار کے لڑکے کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جائے گی، اور اپنی زندگی کی ساری دولت چپ چاپ اس کے حوالے کر دیگی۔ تم ہندو لوگ جنگلیوں کے اخلاق کیا جانو.....؟"

یہ کہہ کر اس نے میری انگلیوں کو پھر شکنجے میں کسا، آف، شدت کا درد تھا اور بڑھتا جا رہا تھا، کیونکہ شکنجے کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی، یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں خیمے میں نہیں جنگل میں لیٹا ہوا ہوں اور کسی جنگلی جانور نے میرا بازو اپنی گرفت سے آزاد نہ کیا تو تھوڑے عرصہ ہی میں اس جنگل میں میری ہڈیاں چمکتی ہوئی نظر آئیں گی۔ درد بڑھ رہا تھا، شاید بازو ٹوٹ جائے گا، ایک کرنباک دھنت سے میں ترپا اور ایک آخری کوشش سے میں نے اپنا ہاتھ شمع کی گرفت سے چھڑایا، لیکن چھڑاتے وقت میرا بھرپور ہاتھ شمع کے حیرے پر جا پڑا، تراخ کی آواز آئی، اس کے لبوں سے ایک دبی سی چیخ نکلی اور پھر وہ خاموش ہو گئی۔

یکایک خدا داد بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، شمع نے بھی جھوٹ موٹ جاگنے کا بہانہ کیا۔

"کیا ہے راہی۔؟" وہ بولی۔

"کچھ نہیں....." میں نے کہا۔

"شاید میں نے ایک چیخ سنی تھی۔" خدا داد بولا۔



”شاید بے چارہ اسی ڈر گیا تھا۔ کیا بہت برا خواب دیکھا تھا۔؟“

شمع نے کہا۔

میرا خون کھول رہا تھا۔ لیکن میں چپ ہو رہا۔

”کیا ہے۔؟“ یکا یک مرجانہ نے آنکھیں کھول کر حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں بے چارہ پر ویسی ڈر گیا تھا۔ بعض سینے بڑے بھیانک ہوتے ہیں۔“

شمع نے بڑی متانت سے کہا۔

”سو جاؤ۔!“

خدا داد نے کروٹ بدل کر کہا۔ اور سو گیا۔

دیر تک خاموشی رہی۔

پھر شمع آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھی اور خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اپنا بندو بھاٹھا اٹھائی اور خیمے کے باہر آ گیا۔ چاند دادی

کے بیچ میں چمک رہا تھا۔ اور شمع ندی کے کنارے بیٹھی منہ دھو رہی تھی۔ میں اس

کے قریب گیا۔ اور اس سے پوچھا۔

”آدھی رات کے وقت منہ دھونے سے کیا ہوگا۔؟“ اس نے گردن

گھما کر میری طرف دیکھا اور میں نے دیکھا کہ اس کے دانتوں سے خون جاری تھا۔ اور

لبوں کے کنارے زخمی تھے۔ شاید میں میرا ہاتھ پڑا ہوگا۔ میں شمع کے قریب زمین پر

بیٹھ گیا۔ اور اوک میں پانی بھر بھر کر اس کے لبوں کے قریب لے جانے لگا۔ تھوڑی

دیر میں خون بہنا بند ہو گیا۔ اور زخمی کناروں پر سرخی کی دو چھوٹی چھوٹی لکیریں رہ گئیں

یا قوت کی رگیں جنہیں چومنے کے لئے میرے ہونٹ بے قرار ہو کر پھرنے لگے۔ لیکن میں



نے انہیں رانتوں تلے دبایا۔ اور حیران ہو کر دیو دار کی اس بمبل کو تلاش کرنے لگا۔  
جواب دہاں نہ تھی: لگا پس ابھی تک اس بمبل کو تلاش کر رہی تھیں۔ جو بدوق کی  
ٹھائیں سے مرگئی تھی۔

لیکن اب وہ شور نہ تھا۔ وہ ٹھائیں نہ تھیں۔ راول کی کرخت آواز نہ تھی۔  
دف کا نغمہ نہ تھا۔ شمع کا رقص نہ تھا۔ اب شمع خاموش میرے سامنے کھڑی تھی اور  
اس کی آنکھوں کی پراسرار گہرائیوں میں چاند چمک رہا تھا۔ اور وادی کی نغمہ ختم  
ہو گئی تھی۔ اور اس کی خاموشی لوٹ آئی تھی۔ اور ہم دونوں اس خاموشی کے بیچ  
میں کھڑے تھے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کیا پہچان رہے تھے۔  
کیا ٹول رہے تھے۔ جیسے دور درجیں آگے بڑھ رہی ہوں۔ اور اپنی نازک غیر  
مرئی انگلیوں سے ان آنکھوں، ان پکیوں، ان رخساروں، اس ٹھوڑی کو پہچان  
رہی ہوں میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں تجھے۔ ہم ایک ہی حرکت کی نال ہیں۔  
ایک ہی بے کی گونج ہیں، ایک ہی سچائی کی تصویر ہیں۔ آج لاکھوں برس کے بعد  
ہم ملے ہیں۔ دو ذرے، دو درجیں۔ دو شرارے ہیں۔ جو اس عظیم ہیڈے کے  
لبطن سے نکل بھاگے ہیں۔ جو تمام کائنات کا منبع ہے اور آج تک اپنی چھوٹی  
سی پہنائی کے گرد گردش کرتے رہے ہیں۔ اور اب یکایک اس طرح چلتے چلتے  
گھومتے گھومتے گردش کرتے کرتے ایک دوسرے کے سامنے آگئے ہیں۔ دو  
آوارہ ستارے، ایک لمحے کے لئے۔ صرف ایک لمحے کے لئے جو ابدی ہے۔  
اندلی ہے۔ جادواں ہے۔ ایک دوسرے کے سامنے — — — عرف  
ایک لمحے کے لئے جو مجھ میں، تجھ میں، اپنے آپ میں بالکل مکمل۔



دوسرے لمحے میں وہ میرے لئے پھرا جیسی تھی۔ اس نے خیمے کی طرف قدم بڑھائے اور لمحہ ختم ہو گیا۔ شرارہ بچھ گیا۔ خاموشی بھاگ گئی اور رات کا شور لوٹ آیا۔ اب دیو داروں میں ہوا کراہ رہی تھی۔ جنگل میں گیدڑ بول رہے تھے۔ ندی قہقہے لگا رہی تھی۔ چاند ہنستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ فضا میں شور و غل رچا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ شمع کے قدموں کی آہٹ اور خانہ بدوشوں کی سانس اور خیمے کے پردوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔ اس لمحے سے پہلے ہر شے خاموش تھی۔ اور اب دوسرے لمحے میں ہر شے بول رہی تھی۔ چیخ رہی تھی۔ اور دماغ میں برے کی طرح گھسنی چلی جا رہی تھی۔ بس یہی ہوتا ہے کبھی ایک لمحہ دوسرے لمحے کی طرح نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں ہوتا۔ اب زندگی کی ترتیب، توازن، توازن اس طرح ہے۔ دوسرے لمحے میں اب یوں ہے۔ اس طرح کیوں نہیں؟

شمع خیمے کا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ میرے قدم خیمے کے باہر رک گئے ہیں وہیں ظالم کے پاس بیٹھ گیا۔ خیمے کے باہر ایک پنپھر پٹھان ظالم اپنی گرم گرم زبان سے میرے ہاتھ پشت چاٹنے لگا۔ اور میں اسے نہ چپکنے لگا۔ اور اس کے کھردرے بالوں میں اپنی انگلیاں ڈال کر اس کی جلد کو سہلانے لگا۔ شاید میں اس کی جلد کو نہیں اپنی جلد کو سہلا رہا تھا۔ اپنے آپ کو تھپک رہا تھا۔ کیونکہ مجھے بہت جلد فیند آگئی اور میں وہیں اسی پنپھر پٹھانوں کی خنک چھاؤں میں سو گیا اور جب جاگا تو تارے گم ہو چکے تھے۔ اور سپیدی سحر نمودار ہو چکی تھی۔ اور شمع سامنے



نڈی میں سے نکل کر میرے خچر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے چلی آ رہی ہے۔ وہ میرے قریب آ کر رک گئی۔ اس نے لکڑیوں کا گٹھا خچر سے اتار کر خیمے کے سامنے ڈال دیا اور مر کر اندر جانے کو بھتی کر میں نے اسے روک کر کہا۔

”لاؤ، میرا بٹوہ مجھے دیدو۔ میں جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے خچر کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

”کیسا بڑا۔؟“ شمع نے متین انداز میں مجھ سے دریافت کیا۔

”وہی جو میں نے ہمیں رات کو دیا تھا۔“

”رات کو دیا تھا۔؟ مجھے۔؟ کیا کہہ رہے ہو۔؟“

”یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے جھٹلا کر کہا۔

”بٹوہ نکالو۔ مجھے جلدی جانا ہے۔“

خداداد اور راول سامنے سے ادھر آ رہے تھے۔

خداداد بولا۔ ”کس بٹوے کی بات کر رہے ہو۔؟“

اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

میں نے چیخ کر کہا۔

”میں نے اسے دیا تھا۔ رات کو مرجانہ کے سامنے۔ کہاں ہے مرجانہ۔؟“

بلاداسے.....؟“

شمع بولی۔

”مرجانہ یہاں نہیں ہے۔ وہ جنگل سے ابھی تک نہیں لوٹی۔ لکڑیاں چننے

گئی ہے۔“



”وہ بھواتم نے اسے کیوں دیا تھا۔“ راول نے مسکرا کر پوچھا۔  
 ”میں نے سوچا اس کے پاس محفوظ رکھے گا۔“  
 ”اچھا تو تم ہمیں ٹھگ سمجھتے ہو۔“ راول چنگھاڑا۔  
 ”رات بھر ہم نے تمہیں پناہ دی، تمہیں ڈاکوؤں کے گاوں میں قتل ہونے  
 سے بچایا اور اب تم ہمیں چور کہتے ہو۔“  
 شمع نے راول کے ہاتھ سے بندوق چھین لی اور مجھ سے کہنے لگی۔  
 ”ابھی چلے جاؤ۔ اسی دم..... ورنہ.....“  
 میں نے شمع کی طرف دیکھا۔ راول کی طرف دیکھا۔ خداداد کی طرف دیکھا  
 اور پھر خچر کو ندی میں ڈال دیا۔



آج راستہ اکیلا تھا۔ میں اکیلا تھا۔ میرے ارد گرد ہر شے اکیلی تھی اور  
 بھوے کے کھو جانے کا بھی ملال نہ تھا۔ پھر کس شے کے کھو جانے کا ملال تھا۔ دل  
 رنجور تھا۔ دماغ پر ایک عجیب سی وحشت۔ ایک نامعلوم سی الجھن چھائی ہوئی  
 تھی۔ اس کا تجزیہ نہ ہو سکتا تھا۔ شمع پر، خانہ بدوشوں پر، اپنے آپ پر ہست  
 رقتا خچر پر، کسی پر غصہ نہ تھا۔ بس ایک ہلکی سی، نازک سی، کبھی ختم نہ ہونیوالی  
 اداسی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی۔ اور خچر آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ ایک  
 خرگوش سامنے سے راستہ کاٹ کر تیزی سے گزر گیا۔ ایک درخت کے نیچے مجھے لومڑی



کی سمور دار دم بھی نظر آئی۔ لیکن میرا ہاتھ بندہ وقف پر نہ گیا۔

ایک جگہ وہ سوکھا ہوا درخت کھڑا تھا جہاں سے پگڈنڈی اپنا رخ ہے۔ لیکن آج مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ پگڈنڈی نے اپنا رخ بدلا ہے۔ یہی محسوس رہا تھا کہ یہ پگڈنڈی اسی طرح ایک ہی رخ پر ایک ہی نیچ پر چلی جا رہی ہے۔ یہ بہت لمبا ہے۔ یہ سفر بے منزل ہے۔ میں اونگھنے لگا۔

بکا یک میں جاگ اٹھا۔ کسی نے ٹہوکا دیکر مجھے جگایا تھا۔ "راہی" "از شمع بولی۔

میں خچر سے اتر پڑا اور ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ تم کیوں آئی ہو۔ کہ صر جا رہی ہو۔ بس ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے کاڑ کے اترے جھنڈے کے قریب ہم دونوں از خود رک گئے۔ اس جھنڈے پر انگور کی جنگلی بیلین پھیلی ہوئی تھیں۔ اور سبز داب پر بیٹھنے کے پھول مسرت آگیاں بوسوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سے دونوں وادیوں کا دلفریب نظارہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک طرف رنگ پو کی راوی تھی۔ دوسری طرف چمن کوٹ کی بیچ ہیں دو وادیاں مل جاتی تھیں۔ اور نقشہ لاجوردی میں ندی کا پانی نقری لہر کی طرح چمک رہا تھا۔

میں نے شمع کی طرف دیکھا۔

اس نے قمیص کے اندر ہاتھ ڈالا اور بوا نکال کر میرے ہاتھ میں دیدیا۔

میں جبر سے اس کی طرف تکیے لگا۔ اور میری نگاہیں اس کے زخمی لبوں

پر جم گئیں۔ وہ یا قوتی رنگین نازک مہین کنارے، بیٹھنے کی پیتوں کے خم

میں اس کے چہرے پر جھک گیا۔



وہ منہ موڑ کر آہستہ سے کہنے لگی۔  
 "مجھ سے شادی کر دو گے۔؟"  
 "شادی۔؟" میں نے پوچھا۔  
 وہ چپ رہی۔ میری طرف دیکھتی رہی۔  
 "شادی۔؟" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم سے" میں سوچنے لگا۔  
 "تم ہمارے گاؤں چلو۔۔۔۔۔ تو پھر۔۔۔۔۔ میں تم سے شادی  
 کر لوں گا۔"

"تمہارے گاؤں۔؟"  
 "ہاں ہاں وہ رہا سامنے رنگ پور۔؟"  
 "لیکن میں گاؤں جا کر کیا کروں گی۔؟" وہ حیران ہو کر بولی۔  
 "میں نمبردار کا بیٹا ہوں۔" میں نے فخریہ انداز میں کہا۔ "وہاں میرا گھر ہے  
 زمین ہے۔ کھیت ہیں۔ مویشی ہیں۔ نوکر، چاکر، عزت، دولت اور۔۔۔۔۔ اور  
 میں رک گیا۔"

وہ بولی۔ "میں چاہتی تھی تم میرے ساتھ چلو۔"  
 "تمہارے ساتھ۔؟ کہاں۔؟"  
 "دھرن کوٹ میں میرا قبیلہ ہے۔ میری ماں کا قبیلہ جسے میرے باپ نے  
 چھوڑ دیا تھا۔ دھرن کوٹ میں آج کل بھی برف ہوگی۔ چاروں طرف سفید، سفید برف۔!"  
 شمع کی جستی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔  
 "تم دونوں وہاں ایک جیسے میں رہیں گے، تمہاری انگریزی بندوبست بہت اچھا



شکار کرے گی۔ تم — ہمارے قبیلے کے سردار ہو گئے۔ رات کو میں دف پرنا چوٹ لگی  
تم نے میرا ناچ دیکھا ہے نا — اس نے اپنا بازو جھٹک دیا۔

میں نے اس قبیلے کو دیکھا۔ چاروں طرف پڑی ہوئی برف کو دیکھا۔ دف کو  
دیکھا۔ میلے کھیلے خیمے کو دیکھا۔ اس لستر کو دیکھا۔ جس سے پرانے دھیال کی بو آتی تھی۔  
اور میرے منہ سے بے اختیار نکلا — "لیکن، شمع،! میرے کھیت، میرا  
گھر، میری دولت، وہ سارا سامان، وہ گاڑیاں، وہ برادری — ان کے  
بغیر میں کیسے زندہ رہ سکوں گا۔؟"

شمع نے نہایت سادگی سے کہا۔ "زندہ رہنے کے لئے یہ کھلی زمین اور یہ  
کھلا آسمان کافی نہیں۔۔۔۔۔۔؟"

"تم سمجھتی نہیں ہو — تم — میں تمہیں کیسے بتاؤں تم خانہ  
بدوش ہو۔"

بیکام اس کی آنکھوں کی روشنی مگر گئی۔ وہ چمک، وہ تابانی جاتی رہی۔  
اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر رک رک کر کہنے لگی۔  
"میں نے تمہیں غلط سمجھا۔ تم وہ آدمی نہیں ہو۔"

"کون سا آدمی۔؟"

"..... جانے دو۔ تم نہیں سمجھو گے۔"

"مجھے بہت افسوس ہے....." میں نے کہا۔

لیکن شمع نے مجھے بیچ میں ٹوک دیا اور بولی۔

"اب میں دھرن کوٹ جانا چاہتی ہوں — اب میں اپنے بھائی



کے پاس نہ جاؤں گی۔ اب ————— راول میرا منہ نہ دیکھے گا۔ آج سے مرجان میرے لئے مر گئی۔ —————!“

”کیا تو یہ خچر مجھے دیدیگا اجنبی۔؟ میرا راستہ بہت لمبا ہے۔؟“  
 راستہ بہت دور ہے اور سفر بے منزل ہے۔ میں سوچنے لگا ہلاکوں برس کے بعد دو خزارے ایک لمحے کے لئے، ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں۔ اور دوسرے لمحے میں الگ ہو کر گردش کرنے لگتے ہیں۔ ایک لمحہ ————— دوسرا لمحہ ————— دونوں میں سات سمندروں کا وقفہ اور سات کائناتوں کا بُعد ہے۔ اس لمحہ انسان کا جنگل سے ناطہ ہے۔ دوسرے لمحے میں یہ ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ ہمیشہ کے لئے.....

”شمع۔!“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”کبھی ایک لمحہ دوسرے کی طرح نہیں ہوتا۔!“

”کیا کہتے ہو تم —————؟“ اس کی پتلیاں حیران تھیں۔

”..... جانے دو۔ تم نہیں سمجھو گی۔“

میں نے خچر کی لگام اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اس نے اپنے زخمی لبوں

کے کناروں پر اپنی تیلی سرخ زبان پھیر کر ایک لمحہ کے لئے میری طرف دیکھا۔ اور پھر اچک کر خچر پر سوار ہو گئی۔ اور پھر میری طرف دیکھے بغیر کہنے لگی۔

”اچھا خدا حافظ۔“

اور پھر میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خچر کو دوڑاتی ہوئی دھرن

کوٹ کے راستہ پر چلی گئی۔



میں دیر تک اس دورا بے پرکھڑا رہا۔ وہ دورا ہا جو شمع کے قبیلے کی  
 طرف جاتا۔ وہ دورا ہا جو میرے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ میں نے دو قدم دھرن  
 کوٹ کے راستے کی طرف بڑھائے۔ پھر ملپٹ کر آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کی طرف  
 چلنے لگا۔



کتبہ ۱۔ اعجاز نبی



